قائداعظم کے رفقاء
سے
ملاقاتیں

مرتب

سید محمد ذوالقرنین زیدی الہما

مرتّب

سیّد محمد ذوالفقار بن زیدی الہاشمی ۷، نومبر ۱۹۳۶ء کو سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور اسی سال لیکچرر کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج نوابشاہ میں ملازمت کا آغاز کیا۔ آپ نے ۸۰-۱۹۷۸ء کے عرصے میں میکریرے یونیورسٹی کمپالا، یوگنڈا میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۷۶ء میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۶۷ء سے لے کر تا حال گورنمنٹ کالج ۹-ایچ، اسلام آباد سے وابستہ ہیں۔

آپ کے مقالات ملک کے اہم اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کی مستقل تصانیف میں حضرت امیر معاویہؓ تاریخ کے آئینہ میں" (راولپنڈی ۱۹۶۹ء) اور "ائمِ حریت" (لاہور، ۱۹۷۲ء) شامل ہیں۔

سلسلہ انٹرویوز : ۱

قائد اعظمؒ کے رفقاء

سے

ملاقاتیں

maablib.org

قائدِ اعظم کے رفقاء

سے ملاقاتیں

مرتب

سید محمد ذوالقرنین زیدی الہما

قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت
پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۰ اسلام آباد
۱۹۹۰ء

جملہ حقوق بحق
قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت
اسلام آباد محفوظ ہیں

طبع اوّل : ۱۹۹۰ء
قیمت : ۷۰ روپے

ISBN. 969-415-019-1

ان انٹرویوز میں جن شخصیات نے بعض متنازعہ مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اس کی ذمہ داری کُلی طور پر ان شخصیات یا کتاب کے مرتب پر عاید ہوتی ہے اور ادارہ نہ تو ان سے اتفاق کرتا ہے اور نہ ہی ان کی صحت یا عدم صحت کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔

طابع

پرنٹنگ پیکیجنگ اینڈ پیپر کنورٹنگ کارپوریشن اسلام آباد

ناشر

قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت
پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۰، اسلام آباد

انتساب

اپنے جلیل القدر والد مرحوم سیّد محمّد ثقلین زیدی کے نام

maablib.org

پیش لفظ

مہذب اور زندہ قومیں ہمیشہ اپنی تاریخ کو بہترین اثاثہ سمجھتی ہیں اور اس کو تحریف اور تخفیف سے محفوظ رکھتی ہیں، بدقسمتی سے ہم نے اپنے قوم و ملک کی تاریخ کو اس انداز سے محفوظ نہیں رکھا جو ہمارے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھا۔ جنہوں نے علم تاریخ میں نئی راہیں منطق اور استدلال کی بنیادوں پر پیدا کیں۔ جس پر مسلمان قوم ہمیشہ فخر کر سکتی ہے۔

میرے خیال میں پاکستان کے دو لخت ہونے کے اسباب میں سے ایک اہم سبب تاریخ سے غفلت اور بے نیازی کا بھی ہے۔ خصوصاً قائد اعظم محمد علی جناح کے جلیل القدر افکار اور ان کے رفقائے کار کی خدمات کو ہم نے اس طریقے سے تاریخ کی زینت نہیں بنایا ہے جس کے وہ مستحق تھے بلکہ قائد اعظم کے خدوخال کو تو ہم نے گزشتہ ۱۱ سالہ دور آمریت میں توڑ موڑ کر پیش کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے جو ہر طرح سے قابل مذمت اور افسوس ناک ہے۔

یہ کتاب قائد اعظم محمد علی جناح اور ان کے رفقائے کار کے بارے میں گرانقدر تاریخی معلومات فراہم کرتی ہے اور تاریخ کے رُخ پر پڑے ہوئے ان دبیز

پردوں کو چاک کرتی ہے جو کہ قائداعظم کے افکار پر ڈالے گئے ہیں اس کے علاوہ حسین شہید سہروردی کی متحدہ بنگال کی تحریک، خان لیاقت علی خان کے قتل، قراردادِ پاکستان اور قراردادِ مقاصد کے بارے میں بلاشبہ نئی معلومات کا اضافہ کرتی ہے۔

ہمارا ادارہ قائداعظم محمد علی جناح، تحریکِ پاکستان اور تاریخِ پاکستان سے وابستہ شخصیات اور افکار سے متعلق ریکارڈ مرتب کرتا ہے اور نہایت مستند، معتبر حقیقت پسندانہ اور رامر ہو جانے والی تصانیف شائع کرتا ہے تاکہ علم و فکر کی روشنی کو اندرون و بیرونِ ملک تک پھیلایا جا سکے۔

تاہم ان انٹرویوز میں بعض متنازعہ فیہ مسائل پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ تاریخ کے ذہین طالب علم متعلقہ شخصیت کی مذکورہ ذاتی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ جیسے قائداعظم کا مسلم لیگ سے استعفےٰ (فروری ۱۹۴۸ء) ان کی ایک پارسی خاتون سے شادی، جس نے بعدازاں اسلام قبول کیا، ان کا یہ خیال کہ مسلم لیگ کے بطور جماعت باقی رہنے کی ضرورت نہیں رہی، سہروردی کے متحدہ بنگال کی سکیم اور اس پر قائداعظم کا ردِعمل۔ بہرحال اختلافی امور کی تمام تر ذمہ داری متعلقہ سیاستدانوں پر اور انٹرویوز کے مؤلف پر عائد ہوتی ہے اور ادارے کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ مگر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تاریخ بھی وقت کی ایک تصویر کشی کی مانند ہوتی ہے۔ ہر مصوّر ایک ہی تصویر کو مختلف زاویے سے پیش کرتا ہے تو ایک سین یا ایک شخصیت مختلف نظر آتی ہے۔ تاریخ کے محققین کے لیے لازمی ہے کہ وہ ایک مدلّل تاریخ لکھنے کے لیے ایسی تمام تصویریں کو دیکھیں تاکہ ہر دور کی صحیح تصویر کشی کر سکیں۔

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے تاریخ کے طالب علم بالعموم

اور محقق بالخصوص استفادہ کریں گے اور جو کام مؤلف نے کیا ہے، اس کو مزید آگے بڑھائیں گے۔ ذوالقرنین صاحب کی یہ کتاب ان کے تحقیقی جذبہ، علمی کاوش اور ذہانت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ گو یہ مختصر ہے مگر اس کی افادیت مسلمہ ہے اور یہ تشنگان علم کو سیراب کرنے کا چشمہ فیض عام ہے۔

ڈاکٹر مس کنیز فاطمہ یوسف
(ڈائریکٹر)

maablib.org

فہرست

پیش لفظ از ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف	۹
مقدمہ	۱۷
۱۔ جناب حسین امام صاحب	۵۲
۲۔ جناب احمد یار خان	۵۸
۳۔ جناب چوہدری نذیر احمد	۶۹
۴۔ جناب ایم۔ ایچ اصفہانی	۷۵
۵۔ جناب محمد ایوب کھوڑو	۸۰
۶۔ جناب ارباب عبدالغفور	۸۶
۷۔ جناب محمد مسعود	۹۳
۸۔ میجر جنرل اکبر رنگروٹ	۹۷
۹۔ ڈاکٹر عمر حیات ملک	۱۰۱
۱۰۔ جناب حمید الحق چودھری	۱۰۵
۱۱۔ جناب ایم۔ ایس۔ طوسی	۱۱۱
۱۲۔ جناب خواجہ شہاب الدین	۱۲۱
۱۳۔ مولانا جمال میاں فرنگی محلی	۱۲۴

maablib.org

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (پ ۱۰۔ سورۃ التوبہ - آیت ۷۰)

ترجمہ: کیا اُن کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو ان سے پہلے تھے نوح کی قوم کی اور عاد کی قوم کی، مدین والوں کی اور الٹی ہوتی بستیوں کے رہنے والوں کی، ان کے رسول ان کے پاس کھلی دلیلیں لے کر آتے تھے۔ پس اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم توڑا کرتے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

مُقدّمہ

سقوطِ مشرقی پاکستان ہماری قومی تاریخ کا بدترین سانحہ تھا۔ اس دل شکن واقعہ نے ہر محبّ وطن شہری کو متاثر کیا۔ تاریخ کا طالبِ علم ہونے کی حیثیت سے میرے شعور اور ضمیر نے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ میں تحقیق کروں کہ آخر وہ کیا اسباب و علل تھے جن کے باعث پاکستان پچیس سالوں کے اندر ہی اندر ٹوٹ گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آزاد ہونے والے ممالک میں پاکستان ہی واحد ایسا ملک ہے جو اس سانحہ سے دوچار ہُوا۔ اس لیے اپنی تاریخی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اس قومی خدمت کے لیے میں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اس معاملہ میں تحقیق کرنے کے لیے پہلے میں نے تاریخی ماخذوں[1] کی طرف رجوع کیا، آل انڈیا مسلم لیگ کا لٹریچر،

---

[1] پاکستان میں ابھی تک سرکاری دستاویزات شجر ممنوعہ ہیں جس کی وجہ سے تحقیق کا راستہ بڑی حد تک مسدود ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کسی سیاست دان یا ریٹائرڈ اعلیٰ سرکاری ملازم کے قلم سے یا منہ سے کوئی بات نکل جاتی ہے تو وہ تاریخی سند کا درجہ حاصل کر لیتی ہے مگر یہ تو سمندر میں ایک قطرہ کے برابر ہے۔ مہذب دنیا میں سرکاری دستاویزات ایک مقررہ مدت کے بعد شائع کر دی جاتی ہیں جس سے محققین استفادہ کرتے ہیں مگر ہمارے ملک میں ابھی اس کی روایت نہیں پڑی جو کہ ملک کے لیے بڑی نقصان دہ بات ہے۔

قومی اسمبلی کی روداد یں، کتابیں، رسالے وغیرہ غرضیکہ جو کچھ مجھے دستیاب ہو سکیں میں نے ان کا بغور مطالعہ کیا۔ اچانک مجھے یہ خیال آیا کہ اُن حضرات سے جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کی رفاقت میں کسی نہ کسی حیثیت سے حصہ لیا تھا اور جو بفضلِ خُدا موجود ہیں، ان سے براہِ راست اس موضوع پر گفت گو کروں تاکہ ان کے نقطۂ نظر کی روشنی میں اس سانحہ کا سائنٹیفک تجزیہ ہو سکے۔ اس طرح ایک عام اور روایتی طرزِ تحقیق سے ہٹ کر جس میں کوئی بھی اسکالر محض موجودہ تاریخی ماخذوں سے حقائق معلوم کرکے اپنی علمی صلاحیت کے مطابق نتائج اخذ کرتا ہے۔ میں نے اپنے نتائج کو ان جلیل القدر حضرات کے خیالات کے تابع کر دیا۔ یہ کتاب انہی ملاقاتوں کا ایک نہایت مختصر خاکہ ہے، جس کو اس یقین کے ساتھ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے کہ یہ کتاب نہ صرف ان کی معلومات میں اضافہ کرے گی بلکہ تاریخ کے زاویۂ نگاہ میں بھی ایک تبدیلی کا موجب بنے گی۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ بڑا کٹھن اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ تاہم مجھے اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی جو کہ خداوند تعالیٰ کی بڑی نوازش ہے۔

یہ کتاب جہاں قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت اور ان کے افکار کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہے وہاں دوسری طرف قائداعظم کے رفقاءِ کار اور ان کے سیاسی حریفوں، آل انڈیا مسلم لیگ کے خدوخال اور اندرونی کیفیت، قرارداد لاہور کا پس منظر، قائداعظم اور خان لیاقت علی خاں کے مابین تعلقات، جناب سہروردی اور ان کی متحدہ بنگال کی تحریک، قرارداد مقاصد کے محرکات، سول بیوروکریسی اور فوج کی سیاست میں مداخلت، ملک میں رُونما ہونے والی محلاتی سازشیں غرضیکہ جو کچھ ملک پر گزری ہے اور پاکستانیوں پر بیتی ہے اس کے بارے میں ایک فکرانگیز زاویۂ نگاہ فراہم کرتی ہے اور قومی تاریخ پر پڑے ہوئے مصنوعی پردوں کو چاک کرکے حقیقتوں کو آشکار کرتی ہے۔

کتاب میں درج حقائق کے بارے میں چند وضاحتیں ضروری ہیں۔ ان ملاقاتوں کے

سلسلہ میں جو کچھ رقم کیا گیا ہے وہ سب متعلقہ حضرات کے خیالات ہیں، اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ حتی الوسع اس میں کسی اضافہ یا کمی کے بغیر انہی کے خیالات کا سہارا لے کر گفتگو کے مفہوم کو ادا کیا جائے۔

ملاقاتوں کا یہ ریکارڈ قوم اور تاریخ کی ایک امانت ہے اور اس کو بلا خوف و خطر نہایت ایمان داری اور خلوص کے ساتھ قوم اور تاریخ کے سپرد کر رہا ہوں اس یقین کے ساتھ کہ تاریخ کے محاسبہ سے کوئی نہیں بچ سکتا چہ جائیکہ مؤرخ ہی کیوں نہ ہو۔ دنیا میں مہذب قومیں اپنے قائدین کے تصورات کو محفوظ کرتی ہیں اور اس بات کا خاص اہتمام کرتی ہیں کہ قائدین کے خیالات اور نظریات کو مسخ نہ ہونے دیں اور آنے والی نسلوں کو منتقل کریں روایات کی منتقلی میں جتنی بھی دیانت داری سے کام لیا جائے کم ہے یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ کوئی بھی تحقیقی کام خواہ وہ کتنا ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوان محقق اپنے وطن عزیز کی تاریخی روایات کو آگے بڑھائیں گے۔

اس کتاب کا مقصد بھی یہی ہے کہ تاریخ دان، دانشور اور دیگر اہلِ قلم اس کو پڑھ کر قومی سطح پر ایسی بحث شروع کریں جس کی روشنی میں ہم اپنی قومی تاریخ کے صحیح خدوخال کو اجاگر کر سکیں یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ سچائی کا بیان کرنا ہر طبقۂ فکر کو پسند نہیں آتا اور اختلاف رائے کا اظہار بھی ایک قدرتی امر ہے لہٰذا وہ حضرات جن کو ان خیالات سے اتفاق نہیں جو اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں اُن کے سلسلہ میں دو وضاحتیں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں پہلے یہ کہ ان کے جذبات یا احساسات کو ٹھیس پہنچانا ہرگز مدِنظر نہیں ہے دوئم یہ کہ شاید نئے حقائق کی روشنی میں وہ اپنے نقطۂ نظر پر نظرِ ثانی کریں۔ یہ کتاب روایتوں کا ایک چھوٹا مجموعہ ہے اس میں مؤلف کی ذاتی آراء کو کوئی دخل نہیں اس لیے حتمی فیصلہ محض اور محض قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

پاکستان مسلمانانِ ہند کی ایک عظیم الشان کامیاب سیاسی جدوجہد کا مظہر ہے۔ اس جدوجہد میں مسلمانانِ ہند کی بقا اور مستقبل کا سوال تھا۔ پاکستان کو معرضِ وجود میں لانے کا سہرا بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے سر ہے جنہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کو ذرّہ سے آفتاب بنا دیا تھا اور محلوں اور ہوٹلوں سے نکال کر ہندوستان کے گلی کوچوں میں مقبولِ عام کیا تھا۔

قائداعظم حصولِ پاکستان کے لیے ایک تاریخی، فیصلہ کن اور چومکھی جنگ لڑ رہے تھے ایک طرف انگریزوں کی مخالفت، دوسری طرف برہمنوں کی عداوت، تیسری طرف نیشنلسٹ مسلمانوں کی مخاصمت اور چوتھی طرف مسلم لیگ کی اندرونی بدحالی اور قوم کی جہالت۔ قائداعظم کی قیادت میں مسلمانانِ ہند اپنی گیارہ بارہ سو سالہ سیاسی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک ایسی سیاسی جدوجہد میں شریک ہوئے تھے جس میں وہ آئین سازی اور حکومت کی تشکیل کے اختیارات اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔

ایک لمحہ کے لیے اگر ہم عہدِ رفتہ کا سرسری جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں مسلمان بحیثیت فاتح کے ۷۱۲ء میں وارد ہوئے۔ ان کی فتوحات کی ابتدا سندھ سے ہوئی۔ محمد بن قاسم پہلا عرب مسلمان فاتح تھا جس نے سندھ اور ملتان کا علاقہ فتح کر کے اپنے خسر اور چچا حجاج بن یوسف کے نام کی لاج رکھ لی۔ حجاج بن یوسف نے ہندوستان پر فوج کشی کرنے کے لیے جب خلیفہ ولید سے اجازت طلب کی تو اس نے اجازت دینے سے انکار کر دیا کیونکہ خلیفہ کی نگاہ میں اس مہم جوئی میں مالی اور جانی نقصان ہونے کا احتمال زیادہ اور فائدہ کم تھا، لیکن حجاج بن یوسف نے تحریراً یہ وعدہ کیا کہ جتنی دولت اس فوج کشی پر بادشاہ کی خرچ ہو گی وہ اس سے دوگنا سہ گنا زیادہ رقم شاہی خزانہ میں جمع کرائے گا۔ اس یقین دہانی کے بعد ولید نے حجاج کو فوج کشی کی اجازت دی۔ جب ملتان فتح ہو گیا اور وہاں سے سونے چاندی کا بھرا ہوا

خزانہ محمد بن قاسم کے ہاتھ لگا تب حجاج نے وہ رقم شاہی خزانہ میں جمع کرائی۔[1]

اس طرح سندھ سے عربوں نے ہندوستان کی فتح کا آغاز کیا۔ اس کے بعد ۹۹۹ء سے لے کر ۱۰۲۶ء تک محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور سومنات پر آخری حملہ میں اس نے راجپوتوں کی طاقت کو پاش پاش کر کے ہندوستان کی دولت کو اونٹوں پر لاد کر غزنی لے گیا۔ پھر ایک سو چھیاسٹھ سال کے بعد شہاب الدین غوری نے ترائن کی دوسری فیصلہ کن جنگ میں کامیاب ہو کر ہندوستان کی فتح کا راستہ ہموار کر دیا۔ اس طرح ۱۲۰۶ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک ہندوستان کے تخت پر مسلمان خاندانوں کی حکمرانی چلتی رہی۔

ان مسلمان حکمرانوں میں جو تختِ دہلی پر جلوہ افروز ہوئے بعض بڑے قابلِ قدر، وسیع النظر اور منصف مزاج بادشاہ تھے۔ خصوصاً مغلیہ خاندان کے جو بڑے تاجدار تھے وہ بڑے عالم اور بڑے روادار حکمران تھے۔ مگر بلاشبہ یہ سب شخصی حکومتیں تھیں جس میں بادشاہوں کے حقوق متبرک تھے۔ کوئی شخص بلا امتیاز مذہب و ملّت، رنگ و نسل ان حقوق کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی اپنی اولاد بھی بادشاہ کی مرضی کی اجازت کے بغیر تخت کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ عام لوگوں کو حکومت کے معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ نہ ہی وہ بادشاہ کے کسی حکم کے خلاف آواز بلند کر سکتے تھے۔ بادشاہ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ جو روشن ضمیر بادشاہ تھے وہ خود رعایا کی خوش حالی اور انصاف کا خیال رکھتے تھے۔ حکومت سے انصاف کی درخواست کی جا سکتی تھی بھیک مانگی جا سکتی تھی مگر مطالبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

---

[1] فتح نامہ سندھ، عرف چچ نامہ ص ۱۲۸+۱۲۶، ۶۲۴-۲۴۵۔ اردو ترجمہ الکامل، ابن اثیر ج ۴ ص ۲۱، ۲۲

شخصی حکومتوں کے اُس دَور میں بادشاہ کو عوام سے کبھی کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا تھا البتہ بادشاہوں کے لیے ان کے جنرل ہمیشہ خطرے کا باعث رہتے تھے اور حکومتوں کا تختہ بالعموم یہی فوجی جرنلز الٹتے تھے یا پھر شہزادے یا بادشاہ کے عزیز و اقارب علمِ بغاوت بلند کر دیتے تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان میں جب مغلیہ خاندان کا زوال شروع ہُوا تو مرکزی حکومت کمزور ہو جانے کی وجہ سے دُور دراز کے صوبہ دار خود مختار ہونا شروع ہو گئے۔ بنگال میں علی وردی خاں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں یورپین اقوام خصوصاً انگریز اور فرانسیسی اپنی تجارتی اور سیاسی برتری قائم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے دست و گریبان تھیں۔

۱۶۰۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہو چکی تھی جس کا صدر دفتر لندن میں تھا۔ ۱۶۰۱ء سے لے کر ۱۷۵۶ء تک انگریزوں نے ہندوستان میں بالعموم اور بنگال میں بالخصوص اپنی تجارتی حیثیت کو بڑا مضبوط اور مستحکم کر لیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ تجارت کے ساتھ ساتھ انہوں نے سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں کے بعد اس کا نواسہ نواب سراج الدولہ تخت نشین ہُوا۔ وہ نوجوان تھا اور نادان تھا۔ انگریزوں نے اس کے جنرل میر جعفر سے ساز باز کر لی۔ جس کے نتیجہ میں ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی ہوئی، جنگ میں نواب سراج الدولہ مارا گیا اور اس کا جنرل میر جعفر اپنی فوجوں کو لیے ہوئے میدان میں کھڑا رہا۔ میر جعفر کو اس کی غداری کے صلے میں بنگال کا تخت نصیب ہُوا۔

میر جعفر کا انگریزوں کی پشت پناہی سے برسرِ اقتدار آنا ہندوستان کی بربادی کا آغاز تھا۔ انگریزوں نے دوسرے حملہ آوروں کی طرح ہندوستان کو نہیں لوٹا کو ان کی لُوٹ مار ان حملہ آوروں سے کہیں زیادہ سنگین اور مہلک تھی۔ میر جعفر کو اقتدار کی ہوس نے

اندھا کر دیا تھا اُس کو اپنی تمنائیں پوری کرنے کے لیے انگریزوں کی سرپرستی کی ضرورت تھی اور انگریزوں کو اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے ایک کٹھ پتلی اور ضمیر فروش ہندوستانی کی ضرورت تھی۔ اس ناپاک اتحاد نے ہندوستان کو گھن کی طرح چاٹ لیا اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کی تمام تجارت کو اور مالیاتی نظام کو درہم برہم کر دیا۔ عوام الناس بدحال ہو گئے غربت ہر طرف پھیل گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد کمپنی نے میر جعفر کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ناکارہ سمجھتے ہوئے تخت سے اتار پھینکا اور میر قاسم کو اس کی جگہ پر بٹھا دیا۔ لیکن میر قاسم کو اہلِ وطن کی بربادی کا درد تھا۔ وہ انگریزوں کے اشارے پر چلنے کے لیے تیار نہیں تھا جس کے نتیجہ میں انگریز اس سے ناراض ہو گئے اور اس کے خلاف ۱۷۶۴ء میں بکسر کے میدان میں فوجی کارروائی کر کے اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور بنگال کو براہِ راست اپنے قبضہ میں کر لیا۔ بنگال پر ۱۷۶۴ء میں انگریزوں کا تسلط ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سو سال کے اندر اندر انگریزوں کی فتوحات بنگال سے شروع ہو کر اودھ تک پھیل گئیں۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے بچے کھچے جاگیرداروں، زمینداروں اور نوابوں نے بنگال کی فوج کی مدد سے انگریزوں کو باہر نکالنے کی آخری کوشش کی مگر وہ اس جدوجہد میں کامیاب نہ ہو سکے جس کے نتیجہ میں ہندوستان ۱۸۵۸ء میں سلطنتِ برطانیہ کا حصہ بن گیا۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جدوجہد میں جو قتل و غارت اور جانی و مالی نقصان ہوا اس کی تمام ذمہ داری انگریزوں نے مسلمانوں کے سر تھوپ دی جبکہ اس جدوجہد میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ مگر انگریزوں کی یہ سیاسی کاریگری تھی کہ انہوں نے ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو تمام افراتفری کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ آزادی حاصل کرنے کی اس ناکام جدوجہد کے بعد ہندو ایسے ہو گئے تھے جیسے گنگا میں نہا کر پاک ہو گئے ہوں اس کے برخلاف مسلمانوں پر قافیہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ اب نہ مسلمانوں کے پاس حکومت

تھی، نہ دولت تھی، نہ عزت تھی، نہ علم تھا اس پر ظلم یہ کہ اب حکومتِ وقت ان کی جان کی دشمن تھی۔

"ایسے سخت و صعب زمانہ میں اور ایسے ہولناک اور پر آشوب وقت میں سارے ہندوستان میں سر سید ہی ایسا بہادر اور دلیر، نڈر اور بے باک شخص تھا جس نے جان پر کھیل کر بڑی آزادی اور بے خوفی کیساتھ "رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھا اور اس مضمون کی پانچسو کاپیاں چھپوائیں اور پارلیمنٹ انگلستان کے ممبروں اور معززین کو بھیج دیں تاکہ وہ دیکھیں کہ مسلمانوں پر اس معاملہ میں ناحق ظلم ہوا ہے علاوہ ازیں ایک کاپی گورنمنٹ انڈیا کو بھی روانہ کردی اس مضمون کے شائع کرنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سرسید کو فوراً گرفتار کرکے گولی سے اڑا دیا جائے کیونکہ انہوں نے ہنگامہ کا سارا الزام بڑی دلیری اور آزادی کے ساتھ اس مضمون میں انگریزوں پر ڈالا تھا مگر چونکہ یہ کام محض مسلمانوں کی قومی ہمدردی سے متاثر ہو کر بڑے خلوص اور نہایت سچائی کے ساتھ لکھا تھا لہٰذا بعض اعلیٰ سرکاری حکام اور ممبرانِ پارلیمنٹ نے کہا اور لکھا کہ سرسید احمد خاں نے اس مضمون میں کوئی بات حق اور انصاف کے خلاف نہیں کی اور جو کچھ کہا دلی سچائی کے ساتھ کہا لہٰذا اس سے کوئی مواخذہ نہ کیا جائے اور اس کے مضمون کو غور اور انصاف سے پڑھا جائے۔"[1]

اس طرح سرسید احمد خاں وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے مسلمانانِ ہند کو اس عالم بے بسی اور مایوسی سے نکالنے کی جدوجہد کی ابتدا کی اور ایسے اقدام اٹھائے جن کی بدولت انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی جو خلیج پیدا ہو گئی تھی اس کو پاٹا جا سکے کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی بقاء کا راز ہی اس حکمت عملی میں مضمر تھا۔ لہٰذا سرسید

---

[1] مقالاتِ سرسید، ج ۹۔ ص ۵۰۔ ۴۸ +

نے مسلمانوں کو انگریزی علوم حاصل کرنے کی تبلیغ کی۔ اس وقت فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جا چکا تھا اور ہندوؤں نے بہت پہلے یعنی ۱۸۲۳ء سے انگریزی زبان کا استعمال شروع کر دیا تھا اور انگریزوں کی نگاہ میں مسلمانوں کے مقابلے میں سبقت لے جا چکے تھے، ان کے تعلیمی اداروں میں انگریزی زبان رائج ہو چکی تھی جس کے نتیجہ میں ۱۸۵۷ء میں سینکڑوں ہندو وکیل، ڈاکٹر، انجینئر اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر پہنچ چکے تھے اور مسلمانوں کے یہاں ابھی انگریزی پرائمری اسکول بھی قائم نہیں ہوا تھا۔

لہٰذا سر سید احمد خاں کی کوششوں سے ۸ جنوری ۱۸۷۰ء کو علی گڑھ میں کالج قائم کیا گیا جس کا افتتاح لارڈ لٹن نے کیا۔ پھر سر سید نے ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ مسلم لیگ سے پہلے سیاسی و نیم سیاسی امور میں یہ ہی قوم کی آواز سمجھی جاتی تھی۔[1]

ایک طرف مسلمانوں کی یہ حالت تھی دوسری طرف بنگال میں ہندوؤں کی سیاسی بیداری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے چند سالوں بعد ہی آزادی اور خود مختاری کے نعرے لگانے شروع کر دیئے تھے۔ اہلِ بنگال میں اس سیاسی بیداری کی بڑی وجہ ان کی علم دوستی تھی۔ انگریزی تعلیم کے حصول میں ہندوستان کی دیگر اقوام کو بہت پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ انگریزی ادب اور تاریخ کے مطالعہ نے انہیں یورپ کے جمہوری اور انقلابی افکار سے روشناس کروایا تھا۔ انہوں نے امریکہ کی جنگِ آزادی، فرانس کا انقلاب اور برطانیہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا۔ جتنے اخبارات اور رسالے اس زمانہ میں بنگال سے شائع ہوتے تھے کسی اور جگہ سے نہیں نکلتے تھے۔ پھر ۱۸۵۸ء میں حکومتِ برطانیہ خود یہ اعلان کر چکی تھی کہ تمام رعایا خواہ گورا ہو یا کالا، خواہ یورپین ہو یا کوئی سب مساوی ہیں

---

[1] شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص ۹۵۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور

اور سہرے پانے کے مستحق ہیں۔ بنگالیوں کے لیے یہ بڑا حوصلہ افزا بیان تھا۔ ان تمام چیزوں کا مل جل کر اثر یہ ہُوا کہ بنگال والوں نے آزادی اور خودمختاری کے لیے آوازیں بلند کرنا شروع کر دیں۔

لہٰذا جونہی انگریزوں کو بنگالیوں کی سیاسی بیداری سے خطرہ لاحق ہُوا انہوں نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے ہندوستان کی مختلف قوتوں اور طبقوں کو ایک دوسرے سے متنفر کرنے کی حکمتِ عملی اپنائی۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کے بڑے مخالف ہیں۔ لہٰذا ان کی اس عداوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے فریقین کو بالکل مذہبی آزادی دے دی تاکہ دونوں قومیں پورے جوش و خروش سے ایک دوسرے کی تکفیر کرتی رہیں اور ہمیشہ دست و گریباں رہیں۔

اس موقعہ پر انگریزوں نے مسلمانوں کی طرف پہلی مرتبہ توجہ کی، اس سلسلہ میں ڈاکٹر ولیم ہنٹر کے دل میں مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ موجزن ہُوا اور انہوں نے ۱۸۷۱ء میں ایک کتاب OUR INDIAN MUSLIMS کے نام سے لکھ کر مسلمانوں کی ذہانت سے کھیلنا چاہا۔ اس کتاب کو پڑھ کر عام تاثر یہ ہوتا ہے کہ اس کا مؤلف بڑا مسلمانوں کا ہمدرد ہے اور وہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر جو حکومت کے خلاف باغیانہ روش پھیلی ہوئی ہے اس کا سدِباب کیا جائے اور جہاد کا جو جذبہ مسلمانوں کے دلوں میں موجزن ہے اس کو سرد کیا جائے۔ دراصل یہ کتاب بڑے مکارانہ طریقے سے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں بنگال کے مسلمانوں کے طبقۂ امراء کی بربادی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ولیم ہنٹر صاحب کو بنگال ہی کے مسلمانوں سے کیوں ایسی محبت اور دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک بنگال ہی کیا شمالی ہند کے بڑے بڑے معزز مسلمان گھرانے اور خود مغلیہ خاندان برباد ہو گیا تھا مغل شہزادے بازاروں میں مزدوری کرتے پھرتے تھے۔ ان لوگوں کی تباہ حالی پر کیوں ان کا دل نہیں

پسیجا : پھر ولیم ہنٹر صاحب کا یہ موقف بھی بالکل غلط تھا کہ وہابی یعنی سید احمد بریلوی کے پیرو کار انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کا عزم رکھتے تھے حالانکہ مؤخرالذکر کی ساری فوجی کارروائی صرف سکھوں کے خلاف تھی۔ سر سید احمد خاں نے خود اس سلسلہ میں ولیم ہنٹر پر کڑی تنقید کی تھی۔ سرسید لکھتے ہیں "ڈاکٹر ہنٹر صاحب کا یہ کل بیان ایک سخت اور ناروا اس قوم کے حق میں جو ہندوستان کو دارالحرب ہونے کے لحاظ سے گورنمنٹ پر جہاد کرنے کو ناجائز سمجھتی تھی۔ اُس نے اِس خیال سے اب تو کیا، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں بھی گورنمنٹ پر جہاد نہیں کیا جس کے برابر آج تک ہندوستان میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوا پس اگر ڈاکٹر ہنٹر صاحب اب بھی یہ بات کہیں کہ ان کا یہ خیال صحیح ہے تو میں ان سے اس امر کا ثبوت چاہتا ہوں کہ وہابیوں نے ہندوستان کے رہنے والے انگریزوں پر جہاد کرنا کب جائز سمجھا ہے"[1]

تاہم ہنٹر صاحب نے یہ کتاب لکھ کر مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسانے کی کامیاب کوشش کی تھی حالانکہ بنگال کے مسلمان امراء کی بربادی میں اس وقت ہندوؤں کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ انگریزوں کا ہاتھ تھا لیکن چونکہ بنگالی نیشنلزم طوفان کی طرح اٹھ رہا تھا اس کو روکنے کے لیے اور مسلمانوں کو ان کے خلاف صف آرا ہو جانے کے لیے یہ تمام کوشش کی جارہی تھی۔ اسی طوفان کو روکنے کے لیے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم کی گئی جس کے بانی اے او ہیوم تھے" جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں کم ازکم سو سے زیادہ ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا[2]

---

[1] مقالاتِ سرسید، ص ۱۸۹ ؛

[2] انڈین نیشنلزم اینڈ دی ارلی کانگریس، ص ۱۸۹ ؛

یہ بات اور بھی دلچسپ ہے کہ اے او ہیوم سے پہلے جناب سر نیدر ناتھ بنرجی نے جو کہ سول سروس سے تعلق رکھتے تھے اور بنگالی تھے اور جنہوں نے ملازمت چھوڑ کر سیاست میں قدم رکھا تھا، تمام ہندوستان کا دورہ کر کے ہم خیال ہندوستانیوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے لیے کلکتہ میں ایک کنونشن طلب کیا۔ اس کے باوجود کہ اس دن ان کا بیٹا فوت ہو گیا تھا مگر انہوں نے جلسہ کی صدارت جاری رکھی اور کسی کو جلسے کے دوران اپنی بربادی کا علم تک نہ ہونے دیا۔ اس طرح مسٹر اے۔ او ہیوم نے اصلی بننے والی کانگریس کے منصوبے کو سبوتاژ کر دیا اور اپنے ہاتھ سے ایسی جماعت بنائی جو حکومت کی وفادار تھی اور اس کے اشارے پر ناچتی تھی۔

انگریز اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر بنگال کو قابو میں نہ رکھا گیا تو پھر ہندوستان کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ انگریزوں کی کمزوری ان کی اپنی روایات اور تاریخ تھی۔ وہ خون خرابہ اور دہشت گردی کے ذریعے لوگوں کو دبانے کے قائل نہیں تھے۔ وہ اپنی غیر معقول اور غیر جمہوری حرکت کو بھی ایک قانونی رنگ دے کر پیش کرتے تھے۔ لہٰذا کانگریس کے قیام کے دو سال بعد کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہندوستان میں جمہوری اداروں کا قیام، اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانات کا ہندوستان میں منعقد ہونا، ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ حکومت میں شریک کرنا اور بجٹ کے معاملے میں ہندوستانیوں کی منظوری لینا ایسی گزارشات تھیں جن کو رد تو نہیں کیا جا سکتا تھا البتہ ٹالا جا سکتا تھا۔ مگر یہ تمام صورتِ حال مسلمانانِ ہند کے لیے پریشان کن تھی کیونکہ نہ تو وہ مقابلہ کے امتحانات سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، نہ انتخابات میں جیت سکتے تھے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے اس قسم کے نعروں نے سر سید احمد خاں کو مضطرب کر دیا۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانانِ ہند کے مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے دوسرے سالانہ اجلاس میں فرمایا تھا چونکہ ہندوستان میں مختلف قومیں آباد ہیں اور ان کی

علمی سیاسی اور عددی حیثیت ایک جیسی نہیں لہٰذا وہ امتحانات سے اور منتخب اداروں سے برابر فائدہ نہیں اٹھا سکیں گی۔ ان کا موقف مسلمانانِ ہند کے لیے توہین و شدید نقصان کی بات نہ تھی۔ اس موقعہ پر وہ فرماتے ہیں: "اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور لٹریچر میں ان کا علم، جو گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں کے لیے ضروری ہے اُس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ہندوؤں کے مساوی ہو؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اب میں مسلمانوں اور اپنے ملک کے ہندوؤں کو اکٹھا کر کے پوچھتا ہوں کہ بنگالیوں سے دونوں برابری کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر یہ امتحان جاری ہو تو غور کرنا چاہیئے کہ ملک کا کیا نتیجہ ہوگا تمام قومیں بنگالیوں کے ماتحت ہو جائیں گی۔ تمام کرسیوں پر بنگالی نظر آئیں گے"[1] اس خطبہ میں آگے چل کر سرسید فرماتے ہیں کہ بنگالی اپنی تعلیم کی وجہ سے تمام قوموں کے سرتاج ہیں اور علمی طاقت سے ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ تک پہنچ گئے ہیں مگر مسلمانوں میں کون ہے جو ان کا مقابلہ کر سکے۔ جو چیز تم کو اعلیٰ درجے پر پہنچانے والی ہے وہ صرف ہائی ایجوکیشن ہے۔ جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے ہم ذلیل رہیں گے اوروں سے پست رہیں گے

اگلے سال ۱۸۸۸ء میں کانگریس پر تنقید کرتے ہوئے سرسید فرماتے ہیں کہ "نیشنل کانگرس کے ممبر آسمان کے تارے ہو جائیں یا سورج بن جائیں، ہم خوش ہیں لیکن ہماری قوم کے دو چار آدمیوں کو ناواجب طور سے اور شرم آمیز دباؤ اور لالچ سے اپنے ساتھ لے کر یہ دکھلانا چاہیے کہ مسلمانوں کی قوم ان کے ساتھ ہے تو اس کا دفاع کرنا ہم پر ضرور واجب ہے۔ سرسید اپنی قوم کے دفاع میں دلیل اور عقل کو پیش کرتے ہیں، وہ عہد رفتہ کے ہندو مسلم تعلقات سے بھی آگاہ ہیں، پھر یہ بھی علم ہے کہ حکومت اعلےٰ عہدوں پر آہستہ آہستہ ہندوستانیوں کو لا رہی ہے مگر کوئی مسلمان آگے نہیں آ رہا ہے کیونکہ جدید علوم سے نابلد ہے بڑے افسوس کے ساتھ

---

[1] خطباتِ سرسید ج ۲- ص ۱۵-۱۴

فرماتے ہیں کہ کلکتہ کے ہائی کورٹ میں ایک کشمیری پنڈت ہندوستانی جج مقرر ہوا، اس کے بعد برابر بنگالی ہائی کورٹ کے جج ہوتے چلے آئے ہیں۔ بلاشک تمہاری بدقسمتی تھی کہ مسلمان جج اب تک نہیں ہوا تھا۔"[1]

اس وقت سر سید احمد خاں مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں حصہ لینے سے روک رہے تھے کہ سیاست میں تو وہ لوگ حصہ لیں جو شعور رکھتے ہوں اور شعور کا تعلق علم سے ہے، ادراک سے ہے اور عقل سے ہے مگر مسلمان علم میں سب سے پیچھے تھے فرماتے ہیں:-

"اس وقت ہماری قوم خراب حالت میں ہے دولت کے لحاظ سے، علم کے لحاظ سے ہمیں انگریزوں سے تعلق رکھنا چاہیئے، حکومت بنگالیوں کے ہاتھ میں نہ جانی چاہیئے۔ ہمیں پولیٹیکل شور و غل سے اپنے آپ کو اس زمانہ میں علیحدہ رکھنا چاہیئے، ہمیں اپنے حال پر غور کرنا چاہیئے۔ اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ ہندو اگر چاہیں تو ایک گھنٹے میں ہم کو تباہ کر دیں، اندرونی تجارت بالکل ان کے ہاتھ میں ہے، بیرونی تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے، جو تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے انہیں کے پاس رہنے دو، ہمارے ملک کی جو تجارت انگریزوں کے ہاتھوں میں ہے اس کو ان کے ہاتھوں سے چھیننے کی کوشش کرو، ان سے کہہ دو کہ آپ تکلیف نہ کریں، ہم خود اپنے ملک کا چمڑہ انگلستان لے جاویں گے" ہمارے ملک کا غلہ اور روئی تم جہازوں پر مت بھرو۔ ہم خود جہازوں میں بھر دیں گے اور خود یورپ لے جاویں گے مگر ان سب باتوں کا ہونا تعلیم پر موقوف ہے اس وقت سیاست میں حصہ لینا اور بنگالیوں کے ساتھ ملنا تمہارے لیے مضر ہے۔"[2]

سر سید ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے وہ ہندو مسلم کو دلہن کی ایک آنکھ کہتے تھے، وہ

---

[1] خطبات سرسید، ج ۲۔ص ۴۷۔

[2] " " " ۔ص ۵۲۔

مسلمانوں کے اور ملک کے خیر خواہ ہیں وہ اس وقت مسلمانوں کی توجہ صرف اور صرف تعلیم کی طرف مبذول کراتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے تھے مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری فطری طور پر پھیلے گی اور ایک وقت ضرور آئے گا جب مسلمانان ہند سیاست کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ سر سید احمد خاں کے علاوہ مسلمانوں کے ایک اور محسن تھے جن کا نام سید امیر علی ہے، جنھوں نے ۱۸۷۶ء میں سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی جو مسلم لیگ کے قیام سے پہلے مسلمانوں کی اہم ترین سیاسی انجمن تھی۔

ایک طرف مغربی تعلیم پھیل رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ مذہبی تنگ نظری اور فرقہ وارانہ رجحانات بڑھ رہے تھے۔ آریہ سماج اور گاؤ رکھشائیں کی سرگرمیاں ہندوؤں کو متشدد بنا رہی تھیں۔ ۱۸۹۳ء میں سینکڑوں انسان فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہو گئے جو کہ "گائے" کے نام پر ملک بھر میں ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں سر سید احمد خاں کا انتقال ہو گیا ان کے بعد مسلمانوں کی قیادت محسن الملک نواب مولوی مہدی علی خاں اور وقار الملک نواب مولوی مشتاق حسین کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ یہ حضرات مسلمانوں کے حالات، ان کی ضروریات اور بڑھتے ہوئے تقاضوں کی شدت سے بخوبی واقف تھے۔ ایک خط میں نواب وقار الملک نے محسن الملک کو تحریر فرمایا:

"کہ بے شک کانگریس میں مسلمانوں کا شریک ہونا خود کشی ہے مگر جب مسلمان قومی حق تلفیوں کی وجہ سے مایوس ہو کر خود کشی کرتے ہیں تو یہ ایک قدرتی امر ہے کیونکہ انسان مایوس ہو کر خود کشی ہی کرتا ہے، پس اگر مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رکھنا ہے تو ضروری ہے کہ ان کی ایک سیاسی جماعت بنائی جائے"[1]

---

[1] سید طفیل احمد منگلوری علیگ "مسلمانوں کا روشن مستقبل"، ص ۳۳۶۔

جونہی انگریزوں نے ۱۹۰۵ء میں اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے بنگال کو تقسیم کیا تو ہر طرف سے آل انڈیا نیشنل کانگریس نے جلسے، جلوس، ہڑتالیں اور ہنگاموں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کانگریس اس تقسیم کے خلاف تھی۔ انگریزی مال کا بائیکاٹ اور سودیشی تحریک کا پرچار ایسے سیاسی حربے تھے جس سے انگریز چکرا گئے۔ یہ ہتھیار ۱۸۵۷ء کی تلواروں اور نیزوں سے زیادہ کارگر تھا کیونکہ برطانیہ کی صنعت اور تجارت اس سے متاثر ہوتی تھی۔ لہٰذا انگریزوں نے وقتی طور پر کانگریس کی طاقت کو توڑنے کے لیے مسلمانوں کی پشت پناہی شروع کی۔ اب حکومتِ ہند خود ایک ایسی جماعت کے ہاتھوں تنگ ہو رہی تھی جس کو اس نے خود ہی جنم دیا تھا۔ لہٰذا اس سیاسی جماعت کا جواب دوسری سیاسی جماعت ہی دے سکتی تھی۔

اس زمانہ میں مسلمان خود بھی چاہتے تھے کہ وہ بھی کسی طرح ہندوستان کے سیاسی افق پر کانگریس کی طرح ابھریں۔ ان کی رائے میں کانگریس ان کے جذبات، احساسات اور مفادات کی ترجمانی نہیں کرتی تھی۔ تقسیمِ بنگال سے مسلمانوں کو تھوڑا سا اقتصادی فائدہ پہنچنے کی امید تھی، کچھ ملازمتوں کے ملنے کی توقع تھی لیکن کانگریس کی شدتِ مخالفت بنگال کے مسلمانوں کو اور زیادہ تقسیمِ بنگال کی حمایت میں سرگرم کر رہی تھی، مسلمانوں کے حلقوں میں سیاسی گہما گہمی ہونے لگی۔ اس وقت سر آغا خاں مسلمانوں میں ایک ایسی شخصیت تھے جو برطانیہ کے شاہی خاندان اور سرکاری حلقوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ وہ لندن میں سیکرٹری آف اسٹیٹ مسٹر مارلو سے ملے اور ان کے سامنے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ پھر فوراً لندن سے شملہ آ کر وائسرائے ہند سے ملاقات کی اور پھر بعد میں مسلمانانِ ہند کا ایک وفد لے کر اکتوبر ۱۹۰۶ء میں وائسرائے ہند سے شملہ میں ملاقات کی۔ مسلمانوں کے اس وفد* نے وائسرائے ہند سے یہ درخواست کی

---

* نوٹ اگلے صفحے پر دیکھیں۔

کہ ان کی سیاسی اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر ان کے مفادات کا خیال رکھا جائے۔

اس کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۰۶ء میں انڈین محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا آخری اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا اور اس اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اس موقعہ پر جناب وقار الملک نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:

"جس مقصد کے لیے آج ہم مجتمع ہوئے ہیں وہ نیا نہیں، یہ اسی روز پیدا ہو گیا تھا جب انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج جب کہ برٹش کی سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے ہمسایہ دوستوں سے پیش آتی ہے اس کی نظائر کم و بیش ہر صوبے میں موجود ہیں تو وائے اس وقت پر جب ہم کو ان لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا جو اورنگ زیب کا بدلہ صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہیں"[1]

اس طرح مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت ۱۹۰۶ء میں قائم کی گئی، یہ کلیتاً ایک سیاسی جماعت تھی اور اس کے دعوے سیاسی تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل قرار پائے :-

ا : حکومت برطانیہ سے وفاداری۔

ب : مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کی حفاظت کرنا۔

ج : دوسری جماعتوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم کرنا۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اس موقعہ پر اگر یہ حقیقت بیان کر دی جائے تو مناسب ہو گا کہ شملہ وفد کی تیاری میں اور اس کے راستے میں حائل سیاسی کانٹوں کو صاف کرنے میں جناب آرچی بالڈ پرنسپل علی گڑھ کالج کا بڑا ہاتھ تھا۔

[1] : سید حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا، ص ۵۴

مندرجہ بالا جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر انگریز بنگال کو تقسیم نہ کرتے اور اس کے خلاف کانگریس صدائے احتجاج بلند نہ کرتی تو غالباً ان حالات میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں نہ آتا۔ غرضیکہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی زندگی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی پیدائش ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مسلم لیگ اپنے پلیٹ فارم سے حکومت کے حق میں نعرے تو لگا سکتی تھی لیکن حکومت کے خلاف زبان نہیں ہلا سکتی تھی کیونکہ یہ منزل وفاداری اور درخواست گزاری کی منزل تھی جس کو انڈین نیشنل کانگریس بہت پہلے عبور کر چکی تھی۔ مسلم لیگ کو اپنی اس سیاسی حکمتِ عملی سے فائدہ بھی پہنچا۔ ۱۹۰۹ء کی نئی آئینی اصلاحات میں حکومتِ برطانیہ نے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت تسلیم کر لی اور ان کے لیے جداگانہ طریقہ انتخاب کو منظور کر لیا۔ یہ مسلمانانِ ہند کی بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس طرح اب وہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپنے حلقوں سے نمائندے منتخب کر کے بھیج سکتے تھے۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۱۱ء میں حکومت ہند نے تقسیم بنگال کو کالعدم قرار دے دیا اور بنگال پھر متحد کر دیا گیا۔ یہ مسلمانوں کے لیے ایک بڑا سیاسی سبق تھا وہ اب سمجھ گئے تھے کہ حکومت ان کو اپنے اشاروں پر نچانا چاہتی تھی اور کانگریس کے دباؤ کے پیشِ نظر حکومت نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ مسلمانانِ ہند کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ وہ قطعی طور پر برطانوی نوازشات کے رحم و کرم پر ہیں۔ ان کی بقاء اور ترقی کا راز اس میں ہے کہ وہ خود اپنے معاملات میں آزادانہ طور سے غور و فکر کریں اور حکومت پر تکیہ نہ کریں۔
چنانچہ ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے اغراض و مقاصد میں ایک اہم تبدیلی کی اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ سرکارِ برطانیہ کی سرپرستی میں حکومتِ خود اختیاری حاصل کرنا چاہتی ہے اور مختلف قوموں کے مابین تعاون قائم کرنا اس کی حکمتِ عملی کا اہم جزو قرار دے دیا گیا مسلم لیگ کے موقف میں تبدیلی کا موجب محمد علی جناح تھے جو مسلم لیگ میں حال ہی میں

شامل ہوئے تھے وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور ہندوستان کی آزادی کے خواہاں تھے وہ بیک وقت کانگرس کے بھی رکن تھے اور مسلم لیگ کے بھی۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کانگریس کے پلیٹ فارم سے کیا تھا اور اُس وقت ان کے سیاسی گرو پنڈت مدن مدہن مالویہ تھے۔

۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نہ صرف مسلمانانِ ہند کے لیے آزادی حاصل کرنے کی خواہش مند تھی بلکہ وہ پورے ہندوستان کے لوگوں کی آزادی کی طالب تھی اور اس جدوجہد میں وہ کانگریس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار تھی۔ دوسری طرف کانگریس نے بھی اپنی سیاسی منزل حکومتِ خود اختیاری کے حصول کو قرار دے دیا تھا، اس طرح کانگریس اور لیگ میں قربتیں بڑھنے لگیں اور ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ ہوا۔ ۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک سرزمینِ ہند پر بڑی بڑی سیاسی معرکہ آرائیاں ہوئیں، رولٹ ایکٹ آیا، تحریکِ خلافت چلی، ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگے، ہجرت کی تحریک چلی، سائمن کمیشن آیا، نہرو رپورٹ مرتب ہوئی، جناح کے چودہ نکات آئے اور گول میز کانفرنس ہوئی، غرضیکہ سب کچھ ہوا مگر ہندوستان کی سیاسی گتھی نہ سلجھ سکی اور نہ ہی ہندو مسلم اتحاد ہو سکا جو ہندوستان کی سیاسی آزادی حاصل کرنے کی اہم ترین شرط تھی۔

دوسری گول میز کانفرنس صرف ایک نشست کے مسئلہ پر فیل ہو گئی، مسلمان مرکز میں ایک سیٹ زیادہ چاہتے تھے اور گاندھی جی ایک سیٹ پر اڑ گئے حالانکہ ایک نشست کی وجہ سے ہندوؤں کے سیاسی توازن میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا جو ان کی بنیادی طاقت کو متاثر کر سکے اور پھر مسلمانوں کو گاندھی جی سے یہ توقع بھی نہیں تھی کہ وہ ایسی روش اختیار کریں گے، مسلمانوں کا گاندھی جی پر اتنا اعتماد تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ احمد آباد میں ۱۹۲۱ء میں مولانا حسرت موہانی نے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ ہندوستان کے تمام مسائل کا حل ایک ہی ہے کہ ہندو اور مسلمان آپس میں صلاح

مشورہ کے بعد مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیں۔ آزادی کے اعلان کے بعد لیگ اور کانگریس کے سامنے ایک ہی مقصد رہ جاتے گا اور وہ ہے سوراج کا تحفظ[1]۔ مگر یہ مسلمانانِ ہند کی خوش فہمیاں تھیں۔ اب کانگریس کی سیاسی قوت اتنی بڑھ چکی تھی کہ وہ نہ مسلمانوں کو خاطر میں لا رہی تھی اور نہ ہی حکومت کو، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کانگریس سے مولانا محمد علی جوہر نکل چکے تھے اور خان عبد الغفار خاں اپنے ہزاروں سُرخ پوش رضا کاروں کے ساتھ کانگریس میں داخل ہو رہے تھے اور گاندھی ارون پیکٹ ہو چکا تھا۔ حکومتِ برطانیہ اس وقت گاندھی جی سے پینگیں بڑھا رہی تھی۔ اس موقعہ پر مسٹر چرچل نے برطانوی حکومت کی کمزور پالیسی کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا تھا: "بڑے آرام سے حکومت نے گاندھی کو شہید بنا دیا ہے، ان کو قومی ہیرو بنایا گیا ہے۔ آپ کو بخوبی اس بات کا اندازہ ہو گا کہ حکومت نے گاندھی کے وقار کو لوگوں کی نگاہوں میں بلند کیا ہے پہلے تو اس با اختیار حکومت نے انہیں اپنا قیدی بنایا پھر قید کے دوران ان سے ملے دعا حاصل کی۔" مسٹر چرچل نے گاندھی جی کے عزائم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"گاندھی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر ان کی جگہ برہمنوں کا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔"

اور کانگریس پارٹی کے خدوخال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

"ایسے برہمن جو دن رات مغربی آزاد خیالی کے تصورات کا قصیدہ پڑھتے پڑھتے نہیں تھکتے اور اپنے آپ کو بڑے فلسفی اور جمہوری سیاستدان کے طور پر پیش کرتے ہیں حالانکہ یہ وہی برہمن ہیں جنہوں نے اپنی قوم کے چھ کروڑ انسانوں کو زندہ رہنے کے بنیادی حقوق سے بھی محروم کر رکھا ہے"

---

[1] شریف الدین پیرزادہ، "فاؤنڈیشنز آف پاکستان" ج ۱، ص ۵۶۳۔

ان کا نام انہوں نے "اچھوت" رکھا ہے۔ جن کے چھو جانے سے یہ لوگ نجس ہو جاتے ہیں۔ یہ نہ ان کے ساتھ کھا سکتے ہیں نہ پی سکتے ہیں، نہ ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرتے ہیں، اس پر یہ اسٹورٹ مل کا فلسفہ اور رُوسو کے انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنی ہی قوم کے افراد سے ایسا غیر مہذب سلوک روا رکھتے ہیں ان کے جمہوری دعووں کو قبول نہیں کیا جا سکتا، کیا ان کے رحم و کرم پر اُن چھ کروڑ انسانوں کو چھوڑ دیا جائے؟ پھر ان چھ کروڑ انسانوں کے علاوہ سات کروڑ مسلمان بھی ہیں اور ان دونوں قوموں اور مذاہب کے درمیان کوئی رشتۂ الفت نہیں [1]

اس طرح اس زمانہ میں گاندھی جی اور کانگریس کا رویہ نہ صرف مسلمانانِ ہند کے لیے باعثِ تشویش تھا بلکہ انگریز خود بھی اس خطرہ کی نوعیت کو سمجھتے تھے۔ یہ مسئلہ مسلمانانِ ہند کے لیے اور بھی پیچیدہ تھا کیونکہ وہ سیاسی طور پر بالکل منتشر تھے اور غیر منظم بھی۔ مذہبی طور پر تو وہ صدیوں سے فرقوں میں بٹ چکے تھے مگر اب سیاست میں بھی یہی صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی اور وہ اپنی ساکھ اور طاقت دونوں کو گنوا چکے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر محمد علی جناح مسلمانوں کی مسیحائی کرتے ہیں لندن سے ۱۹۳۴ء میں واپس آکر بکھری ہوئی* آل انڈیا مسلم لیگ کو متحد کر کے از سرِ نو منظم کرتے ہیں۔ اس وقت لیگ کا کوئی والی وارث نہ تھا جبکہ دوسری طرف آل انڈیا نیشنل کانگرس ایک زبردست طاقت ور سیاسی جماعت بن چکی تھی۔

ہندوستان کو ۱۹۳۵ء میں نئی آئینی اصلاحات سے نوازا گیا جس کی رُو سے صوبائی سطح پر ہندوستانیوں کو پہلی مرتبہ ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے اختیارات سونپے گئے

---

[1] چرچل، "انڈیا"، ص ۱۲۶-۱۲۰، ۴۷، ۹

* اس لیگ کے دو گروپ تھے۔ ایک عبدالعزیز گروپ کہلاتا تھا اور دوسرا حافظ ہدایت گروپ۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت برطانوی ہند میں صوبائی اسمبلیوں کے لیے عام انتخابات ہوئے۔ انتخابات کے نتیجہ میں گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں کانگریس نے اپنی وزارت بنائی اور باقی صوبوں میں غیر مسلم لیگی وزارتیں بنیں۔ ہندوستان کے کسی بھی صوبے میں مسلم لیگ نہ اپنی کابینہ بنا سکی اور نہ ہی پارلیمانی پارٹی بنا سکی۔ اُن صوبوں میں جہاں آجکل پاکستان ہے، صرف دو مسلم لیگی امیدوار کامیاب ہوئے تھے البتہ مسلم لیگ کو اقلیتی صوبوں میں زیادہ نشستیں مل گئی تھیں۔

اس طرح ۱۹۳۷ء میں صوبائی سطح پر آل انڈیا نیشنل کانگریس کا برسرِاقتدار آجانا ایک بڑا سیاسی واقعہ تھا جس نے ہندوستان کی تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔ ایک ایسے ملک میں جہاں صدیوں سے جہالت ایک ادارہ بن چکی ہو اور جہاں حقوق اور فرائض کا نہ کوئی ادراک ہو اور نہ کوئی روایت، ایسے عالم میں کسی بھی پارٹی کا برسرِاقتدار آنا لوگوں کے لیے مایوسی کا پیغام ہوگا چہ جائیکہ ایک ایسا معاشرہ ہو جہاں پر جانوروں کو انسان پر ترجیح دی جائے، یا گائے کا ذبح کرنا ہی مذہب کا ایک نشان بن جائے وہاں ایک ایسے مخصوص گروہ کا برسرِاقتدار آجانا جو کہ اکثریتی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو لازمی طور پر اقلیتی فرقہ کے لیے اور بھی زیادہ خوف اور تشویش کا باعث ہوگا اور پھر شعوری یا لاشعوری طور پر حکمران پارٹی اقلیتوں کے جذبات اور احساسات کو پسِ پشت ڈال دے تو نتیجتہً فرقہ وارانہ کشیدگی کا پھیل جانا ایک فطری امر تھا۔ کانگریس نے اپنے اقتدار کے ڈھائی سالوں میں اپنی حکمتِ عملی سے یہ بات باور کرادی تھی کہ اقلیتیں انگریزوں کے جانے کے بعد کانگرس سے کسی انصاف کی توقع نہ رکھیں محمد علی جناح نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مسلمانانِ ہند کی بقا اور ترقی اسی میں ہے کہ جب تک وہ ہندوستان کی سیاست میں اپنی سیاسی قوّت کا مظاہرہ نہیں کریں گے اس وقت تک نہ صرف ان کے حقوق اور مفادات بلکہ ان کا اپنا وجود بھی خطرے میں پڑا رہے گا۔ لہذا انہوں نے مسلمانانِ ہند کو مسلم لیگ کے پرچم تلے اکٹھا ہو جانے کی دعوتِ عام دی کانگرس

کی متکبرانہ اور فرقہ وارانہ پالیسی کے نتیجہ میں عام مسلمانوں کو یقین ہو گیا تھا کہ کانگریس کے لبادہ میں ہندو راج قائم ہو گیا تھا اور اب ہندو لازمی طور سے صدیوں کے بدلے مسلمانوں سے لیں گے کیونکہ اب ان کے پاس طاقت آچکی تھی مختصر سے عرصہ میں محمد علی جناح کی مقناطیسی شخصیت اور بے داغ کردار نے مسلمانانِ ہند کو بڑا حوصلہ عطا کیا، اس مختصر سے عرصہ میں انہوں نے مسلم لیگ کو ایک فعّال جماعت بنا دیا، ایک ایسی سیاسی جماعت جو کانگریس سے بھی سینہ ٹھونک کر بات کر سکتی تھی اور حکومت سے بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی تھی۔ لہذا ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنا نصب العین مکمل آزادی کو قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ:

> "آل انڈیا مسلم لیگ کا مطمح نظر یہ ہے کہ وہ ایسی آزاد جمہوری ریاستوں کے وفاق کی صورت میں کامل آزادی حاصل کرے گی جس میں آئین کے اندر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفادات مناسب اور مؤثر طریقے سے محفوظ ہوں۔"[۱]

جب مسلم لیگ اپنے آپ کو منظم کر رہی تھی تو دوسری طرف کانگریس کا رویہ اور زیادہ حقارت آمیز ہوتا جا رہا تھا وہ مسلم لیگ کو کوئی سیاسی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھی بلکہ اس نے مسلم لیگ کو مٹانے کی کوششیں بھی کیں۔ اس دوران میں ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ مسلمانوں کے لیے ایک بڑا قیمتی موقعہ تھا۔ انگریز جنگ میں پھنسے ہوئے تھے اور جرمنی کی یلغار جاری تھی۔ انگریز ہر محاذ پر اس وقت شکست کھا رہا تھا لہذا موقعہ کو غنیمت جان کر آل انڈیا مسلم لیگ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں یہ قرارداد پاس کی جو بعد میں قراردادِ پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔

---

[۱] "فاؤنڈیشنز آف پاکستان"، ج ۲، ص ۲۷۰

"کہ اس اجلاس کی یہ رائے ہے کہ اس ملک کے لیے کوئی آئینی منصوبہ نہ ہی قابلِ عمل ہوگا اور نہ ہی مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہوگا جب تک کہ اُسے ان بنیادی اصولوں پر نہ استوار کیا جائے یعنی جغرافیائی اعتبار سے متصل و ملحق یونٹوں پر مشتمل علاقوں کی حد بندی کی جائے اور ضروری علاقائی ردّ و بدل اس طرح کی جائے اور یہ کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں کی طرح جن علاقوں میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان اکثریت میں ہیں انہیں "خود مختار ریاستیں" قرار دیا جائے جس میں ملحقہ یونٹ آزاد اور خود مختار ہوں گے۔"

"یہ کہ ان یونٹوں کی اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے ان کے صلاح مشورہ سے دستور میں مناسب مؤثر اور واضح انتظامات رکھے جائیں۔"

"اور ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کے اور دیگر اقلیتوں کے صلاح مشورے سے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔"

اگر اس قرارداد کو غور و فکر سے پڑھا جائے تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ قائداعظم نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے بلکہ وہ ہر ہندوستانی کو بلا تفریق رنگ و نسل و عقیدہ آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ قرارداد لاہور کے بعد پاکستان کی تحریک روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ مسلمانانِ ہند بڑی تعداد میں مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے۔ ان شامل ہونے والوں میں ہر طبقۂ خیال، ہر مکتبِ فکر اور ہر صوبہ کے مسلمان شامل تھے۔ ان میں نوابین بھی تھے، جاگیردار بھی تھے، امیر بھی تھے، غریب بھی تھے پڑھے لکھے بھی تھے اور نیم خواندہ بھی تھے۔ عالم بھی تھے اور جاہل بھی تھے، مخلص بھی

تھے اور موقع پرست بھی تھے۔ مذہبی بھی تھے غیر مذہبی بھی تھے، قدامت پسند بھی تھے اور ترقی پسند بھی تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کی منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی گئی اور ساتھ ہی ساتھ یہ سوالات "کہ پاکستان کا آئین کس قسم کا ہوگا" اور "پاکستان کی حکومت کس طرز کی ہوگی" مسلم لیگیوں کے مابین موضوعِ بحث بنتے گئے۔ ۱۹۴۳ء کے دہلی کے تیسویں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے منعقد ہونے سے قبل صورتِ حال کافی پیچیدہ ہوگئی تھی جبکہ "مسلم لیگیوں کے ایک گروپ نے یہ تجویز کیا کہ مسلم لیگ یہ اعلان کردے کہ پاکستان کا آئین قرآن پر ہوگا اور اس سلسلہ میں ڈاکٹر عبدالحمید قاضی نے جن کا تعلق بمبئی سے تھا، ایک قرارداد بھی اجلاس میں پیش کرنے کے ارادے سے تیار کر لی تھی کہ پاکستان کا آئین حکومتِ الٰہیہ کے طرز پر ہوگا یعنی وہ اصول جو خلفائے راشدہ نے بنائے مگر قائدِاعظم کے خطبۂ صدارت کے پیشِ نظر انہوں نے اپنی قرارداد پیش نہیں کی۔"[1] قائدِاعظم ان سوالات کے مضمرات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت میں بالکل صاف صاف اور بغیر کسی ذہنی تحفظ کے پاکستان کے مستقبل کے آئین اور طرزِ حکومت کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کرنا اپنا اخلاقی، قومی اور تاریخی فریضہ سمجھا۔ اپنے خطبۂ صدارت کے دوران آپ نے فرمایا کہ "میرے ذہن میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں اور تم لوگوں میں سے اکثریت کے ذہن میں پاکستان کی حکومت کا جو تصوّر ہے وہ ایک عوامی حکومت کا ہے۔ دستور بنانے کے لیے اسمبلی میں آپ اپنے نمائندے خود ہی منتخب کریں گے ... لیکن مجھے یقین ہے کہ جمہوریت ہمارے خون میں گردش کرتی ہے لیکن صدیوں کے نامساعد حالات نے

---

[1] شریف الدین پیرزادہ "فاؤنڈیشنز آف پاکستان"، ج ۲، ص ۴۰۴۔

دوران خون کو سرد کر دیا ہے، یہ یخ بستہ ہو چکا ہے اور آپ کی آنتیں ٹھیک کام نہیں کر رہی ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ادا کریں کہ خون میں دوبارہ حرارت آگئی ہے اور اس کا سہرا مسلم لیگ کے سر ہے۔ یہ بلاشبہ عوامی حکومت ہوگی۔"

اس خطبہ میں آگے چل کر قائداعظم سرمایہ داروں اور زمینداروں کو خبردار کرتے ہیں جن کے استحصالی ہتھکنڈوں کے باعث ان گنت انسان ایک وقت کی روٹی کے محتاج ہیں۔ قائداعظم فرماتے ہیں کہ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا قیام پاکستان کا یہی مطلب ہے؟ کیا آپ کے ذہن میں پاکستان کا ایسا تصوّر ہے جہاں لاکھوں لوگوں کا استحصال کیا جائے اور انہیں ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہ ہو؟ اگر آپ کے ذہن میں پاکستان کا ایسا ہی تصوّر ہے تو پھر مجھے ایسا پاکستان نہیں چاہیئے ..... پاکستان کا آئین صرف ملت اور عوام کے ہاتھوں سے تیار ہوگا۔ دستور کا اور حکومت کا فیصلہ لوگ کریں گے۔ .... اور جہاں تک پاکستان میں اقلیتوں کے تحفظ کا سوال ہے ہم نے اقلیتوں کو مکمل تحفظات دینے کے لیے قرارداد پاس کی ہے ہم نے اس امر کی کہ ان کے حقوق کا مکمل تحفظ کیا جائے گا، صاف اور واضح یقین دہانی کرائی ہے۔[۱]

قیام پاکستان سے قبل ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد موقعوں پر قائداعظم مجوزہ پاکستان کے طرزِ آئین اور طرزِ حکومت کے بارے میں یہی فرماتے ہیں کہ عوامی نمائندے ہی آئین بنائیں گے اور حکومت بھی عوام ہی کی ہوگی۔ وہ مذہبی ریاست کے قیام کے خلاف تھے حکومت کو مذہب کی اساس پر قائم کرنے کے تصوّر کی یا رجحان کی مذمت فرماتے ہیں جیسا کہ ایک مقام پر ۲ اپریل ۱۹۴۶ء میں فرمایا: "آخر ہم کس مقصد کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں؟ ہمارا مطمح نظر کیا ہے؟ ہمارا مقصد تھیوکریسی قائم کرنا نہیں ہے۔ ہم نہ ہی مذہبی ریاست کے قیام کے لیے سرگرم عمل ہیں۔"

---

[۱] شریف الدین پیرزادہ، "فاؤنڈیشنز آف پاکستان"، ج ۲، ص ۴۲۴،۲۵ +

مذہب اپنی جگہ ہے اور مذہب ہمیں عزیز ہے۔ جب ہم مذہب کی بات کرتے ہیں تو دنیا کی تمام چیزیں اس کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہیں لیکن مذہب کے علاوہ اور بھی چیزیں ہیں جو بہت اہم ہیں۔ ہماری معاشرتی زندگی، ہماری اقتصادی زندگی لیکن سیاسی طاقت کے بغیر ہم کس طرح اپنے عقیدہ اور اپنی اقتصادی زندگی کا تحفظ کر سکتے ہیں؟[1]

۱۹۴۵ء کے انتخابات کے لیے مسلم لیگ نے جو منشور مرتب کیے تھے ان میں یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ پاکستان میں طرزِ حکومت کس قسم کا ہو گا کس قسم کی اصلاحات نافذ کی جائیں گی۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے منشور میں حکومت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے۔ قائد اعظم کے الفاظ میں وہ یہ ہے:

"حکومتِ پاکستان کو تمام آبادی کی حمایت حاصل ہو گی۔ حکومت عوام کی مرضی اور خواہشات کے مطابق کام کرے گی۔ حکومت اپنی کارکردگی کے سلسلہ میں ذات پات، عقیدے یا رنگ کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھے گی۔"[2]

قائد اعظم محمد علی جناح کے ذہن میں جو تصور تھا وہ انسانی آزادی اور حرمت، عدل و مساوات اور بھائی چارے کا تھا اور یہی اسلام کی آفاقی قدریں ہیں۔ انہیں اپنے قول اور اپنے الفاظ کا ہمیشہ پاس تھا۔ انہوں نے جس طرح ہر اہم موقع پر عوامی حکومت کے قیام کا اعلان فرمایا اسی طرح اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا یقین دلایا لہٰذا جب ۳ جون ۱۹۴۷ء کو قیامِ پاکستان کا اعلان ہو گیا تو قائد اعظم نے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو جب طلب کیا تو آئین ساز اسمبلی کی عارضی صدارت کے لیے ان کی نگاہِ انتخاب جناب جگندر ناتھ منڈل پر پڑی جو کہ ایک ہندو[3] تھے اور اقلیت میں

---

[1] شریف الدین پیرزادہ، "فاؤنڈیشنز آف پاکستان" ج ۲، ص ۵۲۳۔

[2] پنجاب پراونشل مسلم لیگ مینی فسٹو، ص ۲۔

[3] کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی آف پاکستان ڈی بیٹس، ج ۱، ص ۱۔

بھی ان کا تعلق شودھروں سے تھا جن کو برہمن اچھوت کہتے ہیں۔ اس اہم ترین تاریخی موقعہ پر قائداعظم نے جوگندر ناتھ منڈل کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی صدارت کی کرسی پر بٹھا کر یہ بات ثابت کردی کہ وہ رنگ ونسل، ذات پات اور عقیدے کے امتیازات سے بلند تر تھے۔ پھر قائداعظم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو بحیثیت بابائے قوم، بحیثیت گورنر جنرل اور اسپیکر پاکستانی قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اب اگر ہم اس عظیم مملکت پاکستان کو خوش حال اور ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں قطعی طور پر اور کلی طور پر عوام الناس کو خوشحال بنانے پر توجہ مرکوز کرنی پڑے گی۔ خاص طور سے مفلوک الحال عوام کو۔ اگر آپ ماضی کو بھول کر اور عداوتوں کو دفن کر کے باہمی تعاون سے کام کریں گے تو لازماً آپ کو کامیابی ہوگی۔ اگر آپ ماضی کو بدل ڈالیں اور اس جذبہ کے ساتھ مل کر کام کریں کہ آپ میں ہر ایک مرد، خواہ وہ کسی فرقہ کا ہو، ماضی میں آپ کے اور اس کے تعلقات کیسے ہی رہے ہوں اور اس کا کچھ ہی مذہب ہو وہ اول، دوم اور آخر اسی ریاست کا شہری ہے۔ اس کے حقوق برابر ہیں۔"[۱]

قائداعظم نے اپنے پہلے طویل تاریخی خطبہ میں اپنے روشن خیالات کا اظہار فرما کر پاکستانی قوم کو ان کی کوتاہیوں اور کمزوریوں سے آگاہ کیا اور ان کو نصیحت کی کہ وہ مل جل کر اچھے اور مہذب انسانوں کی طرح رہیں۔ آپ نے رشوت خوری، اقربا پروری اور علاقائی تعصبات کو ختم کرنے کی تلقین فرمائی۔ آپ کی یہ دلی خواہش تھی کہ سرکاری ملازمین عوام کی خدمت کریں، فوج سرحدوں کی حفاظت کرے، سیاست دان ملک کو ترقی کی راہ پہ گامزن کریں۔ پاکستان کے قیام کا مطلب مظلوموں کو ہر قسم کے استحصال سے نجات دلانا تھا۔ انگریزوں سے اقتدار اسی لیے حاصل کیا جا رہا تھا کہ پاکستان کو ایک فلاحی مملکت

---

[۱] کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی آف پاکستان ڈی بیٹس ج ۱ ص ۱۰

بنایا جائیگا جہاں پر ہر انسان کے لیے ترقی کے یکساں مواقع ہوں گے۔ جہاں پر وہ آزاد ہوگا اور جہاں اس سے رنگ و نسل یا عقیدے کی بنیاد پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائیگا۔

مگر ہم نے قائداعظم کی ان خواہشات اور نیک تمناؤں کا خیال نہیں کیا۔ برخلاف اس کے لوگوں کو بدحال کیا۔ انصاف کو ملیا میٹ کیا، ملک کو مقروض کیا، علاقائی تعصبات کو فروغ دیا۔ فرقہ وارانہ منافرت کو پروان چڑھایا، ایک صوبے کے لوگوں کو دوسرے صوبے کے لوگوں سے متنفر کیا، اچھوں کو بُرا کہا اور بُروں کو اچھا کہا، ذرائع ابلاغ کو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ وہ لوگ جو قائداعظم اور پاکستان پر مر مٹنے کے لیے تیار تھے ان کو غدار کہا گیا، ان کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ ابتدائی پچیس سالوں میں لوگوں کی اتنی توہین کی گئی اور ان کے ساتھ ایسا ظلم روا رکھا گیا جس کی مثال نہیں ملتی۔

۱۹۵۴ء میں جب مشرقی پاکستان میں عام انتخابات ہوئے تو اس کے نتیجہ میں ۳۱۰۔ اراکین کی صوبائی اسمبلی میں ۳۰۱۔ اراکین مسلم لیگ کے مخالفین منتخب ہو کر آئے۔ مرکزی حکومت نے ان منتخب شدہ نمائندوں سے خائف ہو کر سازشیں شروع کر دیں۔ چار کروڑ انسانوں کے منتخب نمائندوں کو بیک جنبش قلم ایک طرف اٹھا کر پھینک دیا گیا۔ ان کے قائد* کو غدار کہا گیا، اُن کو نظر بند کر دیا گیا اور ان کے گھر پر فوج کو بٹھا دیا گیا۔ ۵۵ء میں جناب سردار فضل الکریم نے بڑے افسوس کے ساتھ دوسری دستور ساز اسمبلی میں کہا کہ "مرکزی حکومت مشرقی بنگال سے کس قسم کا سلوک روا رکھتی ہے؟ صوبائی انتظامیہ کی خواہشات کے خلاف فوج کو طلب کیا گیا ــــ میرا مطلب ہے کہ وزیراعلیٰ اور وزراء کابینہ کی خواہشات کے خلاف ــــ اور وزیراعلیٰ کو نظر بند کر دیا گیا۔"[۱] یہ تمام

---

* مولوی فضل الحق شیر بنگال کو برطرف کر دیا گیا جو کہ وزیراعلیٰ تھے ان کو غدار کہا گیا۔

۱۔ دوسری آئین ساز اسمبلی کی روئداد، ص ۱۵۳۳۔

دھاندلیاں طاقت کے بل بوتے پہ ہو رہی تھیں۔ اس وقت فوج مرکزی حکومت کی پوری حمایت کر رہی تھی۔ بنگالیوں کے دوسرے قائد کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ محمد علی بوگرہ جبکہ وہ امریکہ کے دورے پہ تھے ان کو واپس آنے کا فوراً حکم دیا گیا اور لندن سے بقول جناب نور الامین صاحب، جنرل ایوب خاں اور جنرل اسکندر مرزا ان کو اپنی حراست میں لے کر کراچی پہنچے۔ غلام محمد نے ان کو گالیاں دیں اور غلام محمد نے تکیہ کے نیچے سے ریوالور نکال لیا اور جب تک بوگرہ نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کر لیا۔ گورنر جنرل اسے قتل کی دھمکیاں دیتا رہا۔ جب یہ کارروائی ہو رہی تھی تو محمد ایوب خاں ریوالور ہاتھ میں پکڑے پس پردہ کھڑے تھے"[1]

پھر جناب حسین شہید سہروردی کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، ان کو بار بار دھوکا دیا گیا ان کے اعتماد کو چکنا چور کیا گیا یہاں تک کہ انہیں بڑے افسوس کے ساتھ ۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو اسمبلی میں یہ کہنا پڑا کہ ان سے چھ مرتبہ مختلف موقعوں پر عہد و پیمان کر کے ان کو توڑا گیا ہے[2]۔ جو محب الوطن حضرات تھے اور دُور بین تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ کھیل پاکستان کی قسمت سے کھیلا جا رہا ہے انہوں نے بہت پہلے آنے والے طوفان کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ جناب ظہیر الدین نے ۱۹۵۵ء میں اسمبلی میں لوگوں کو خبردار کیا تھا کہ پاکستان کو توڑنے کی سازشیں کی جا رہی ہیں اور اس کے پیچھے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اقتدار پہ قبضہ جما رکھا ہے۔ میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اُس طرف کچھ اراکین* ہیں جو علیحدگی پسند ہیں اور جو پاکستان کی یک جہتی پر یقین نہیں رکھتے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان کے

---

[1] صفدر محمود، "مسلم لیگ کا دورِ حکومت"، ص ۲۳۰۔

[2] دوسری آئین ساز اسمبلی کی روداد یں، ص ۱۵۸۶۔

* یہ اشارہ تھا سروسز کے لوگوں کی طرف جو برسر اقتدار آ گئے تھے۔

بنانے میں کوئی حصہ نہیں لیا اور نہ ہی پاکستان کے لیے لڑے ہیں وہ پاکستان کو توڑنا چاہتے ہیں۔[۱]

وہ لوگ جو قائد اعظم اور پاکستان کے نام پر مٹنے کے لیے تیار تھے ان کو غدار کہا گیا
یہی لوگ تھے جو پاکستان کی عزت اور وقار کے محافظ تھے اور قائد اعظم کے شیدائی تھے۔
یہ وہی لوگ تھے جو آئین ساز اسمبلی کے اندر کسی معزز رکن کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے
تھے کہ وہ بابائے قوم کو صرف مسٹر جناح کہہ کر پکاریں۔ شیخ مجیب الرحمٰن، ابوالمنصور اور
ظہیر الدین نے بار بار اسمبلی کی کاروائی میں صرف اس وجہ سے رخنہ اندازی کی کہ ان کی نگاہ
میں ایوان میں قائد اعظم کا نام عزت اور احترام سے نہیں لیا جا رہا تھا۔

ایک مسلم لیگی نے جب اپنی تقریر کے دوران "مسٹر جناح" کہہ دیا تو شیخ مجیب الرحمٰن
نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ قائد اعظم کا لفظ استعمال کریں۔ جناب ظہیر الدین نے جو کہ عوامی لیگی
تھے بڑے افسوس سے اسپیکر سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بابائے قوم کا نام عزت
اور احترام سے لیا جائے ہم اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ ان کی بے عزتی ہو۔[۲]

یہی شیخ مجیب الرحمٰن تھے جنہوں نے اسی آئین ساز اسمبلی میں کہا تھا کہ:

"میں ایک غریب اور ادنیٰ رضا کار تھا جس نے پاکستان کے قیام کی
کوششوں میں اپنی تعلیمی زندگی کو برباد کر دیا۔"

ایک اور موقعہ پر اسی اسمبلی میں مجیب نے کہا کہ "قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ
پاکستان غریبوں کے لیے حاصل کیا جا رہا ہے۔ غریب لوگوں کو پاکستان میں انصاف
ملے گا۔" شیخ مجیب الرحمٰن نے اس تصور کی بھی مذمت کی کہ آزمائش کی گھڑی میں
مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کو بچائے گا۔ دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل

---

[۱] دوسری آئین ساز اسمبلی کی روداد ص ۱۵۶۱۔

[۲] " " " " ص ۱۹۱۱، ۱۹۰۵۔

کا فاصلہ ہے۔ بوقتِ ضرورت نہ ہم ادھر سے آپ کی مدد کو آسکتے ہیں اور نہ آپ ہماری مدد کو آسکتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ دونوں بازوؤں کو مضبوط رکھا جاتے۔ مجیب نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"پاکستان کے دو بازو ہیں، ایک مغربی پاکستان اور دوسرا مشرقی پاکستان اگر آپ ایک بازو کو مضبوط کریں گے تو دوسرا بازو خود بخود کمزور ہو جائے گا"

"جناب عالی! یہ حکمتِ عملی غلط ہے۔ یہ حکمران ٹولہ جس کو مغربی پاکستان کے جاگیرداروں اور زمین داروں کی حمایت حاصل ہے، اس نے مغربی پاکستان کی رائے عامہ کو کچل کر رکھ دیا ہے، وہ فریاد نہیں کر سکتے، وہ مطالبہ نہیں کر سکتے، لیکن ہم لوگ جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے۔ ہم سیاسی طور پر بہت بیدار لوگ ہیں، ہم ہر ایک کو للکارتے ہیں اور کسی ایک کو بھی للکار سکتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کو اس حکمران ٹولہ کی تباہ کاریوں سے بچایا جائے جو عوام کا استحصال کر رہا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے پاکستان کو بڑی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے۔ مگر یہ لوگ٭ جو آج حکومت کر رہے ہیں یہ دو آنے کے بھی ممبر نہیں ہیں، یہ اسلام کا نام لے کر پاکستان کو برباد کرنا چاہتے ہیں! ان لوگوں نے گزشتہ سات آٹھ سالوں سے کبھی اسلام کا نام لے کر، کبھی انصاف کا نام لے کر اور کبھی قائداعظم کا نام لے کر ہر قسم کے گھناؤنے کام کیئے ہیں اور کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں" لے

سقوطِ مشرقی پاکستان سے بہت پہلے سمجھ دار لوگوں نے قوم کو آگاہ کر دیا تھا۔ فیروز خاں نون نے، مظفر حسین قزلباش نے، سردار عبدالرشید خان نے آنے والے خطرات

٭ اسکندر مرزا، چودھری محمد علی، ایوب خاں اور گورمانی وغیرہ۔

لے دوسری آئین ساز اسمبلی کی روداد یں، ص ۱۹۱۸، ۱۵۲۵۔

کی نشاندہی کر دی تھی۔ فضل الرحمٰن نے آئین سازی میں رخنہ اندازی کا الزام چودھری محمد علی پر عائد کیا تھا، اسی طرح غلام محمد نے جو پہلی آئین ساز اسمبلی توڑی تھی اور خواجہ ناظم الدین کو برطرف کیا تھا اس کی بھی ذمہ داری چودھری محمد علی پر عائد کی تھی۔ مگر کون تھا ان لوگوں سے پوچھنے والا؟ بندوق ان کے ہاتھ میں تھی اور فوج ان کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ انہوں نے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے پاکستان کو داؤ پر لگا دیا اور عوام کو بدحال کر دیا۔ ۱۹۵۶ء کا آئین اس وقت تیار ہوا جبکہ مشرقی پاکستان کے قائدین کو ایک ایک کر کے ذلیل کیا جا چکا تھا اور بنگالیوں کے دل کو چھلنی کر دیا گیا تھا۔ ہیرا پھیری کر کے ان کی اکثریت کو برابری میں بدل دیا گیا اور جب وہ آخری کوشش کر رہے تھے کہ ملک کے معاملات سیاسی طریقے سے حل کیے جائیں تو ۱۹۵۸ء میں فوج کی آمد نے ان کو بالکل ہی مایوس کر دیا تھا اور ان کو اس بات کا یقین کامل ہو چکا تھا کہ اب ان کی راہیں مسدود ہیں

۱۹۵۶ء کے آئین سے قبل مشرقی پاکستان کے قائدین کی توہین کی جا چکی تھی، ان کے خلوص اور ان کی نیک نیتی کا مذاق اڑایا جا چکا تھا اور ان کو بے بس، مضمحل اور کمزور کر دیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے مقابلے پر مغربی پاکستان کو ایک یونٹ کی شکل میں محاذ آرائی کے لیے صف آرا کر دیا تھا۔ ون یونٹ کی تشکیل کے پیچھے بڑے ناپاک عزائم کارفرما تھے۔ مشرقی پاکستان کی اکثریت کو برابری میں تبدیل کر دیا گیا، سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا۔ اُن تمام عہد شکنیوں، دھاندلیوں اور شرمناک سلوک کے باوجود جس کا مرتکب مرکزی حکمران ٹولہ ہوا تھا مشرقی پاکستان کے قائدین پھر بھی حوصلہ اور ضبط سے کام لیتے ہوئے سیاسی معاملات کو سیاسی طریقوں سے طے کرنے کے خواہش مند تھے اور حامی تھے۔ لہٰذا جب ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت عام انتخابات کی تیاری اپنے پورے عروج پر تھی تو فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ فوج کی آمد نے مشرقی پاکستانیو کو بالکل مایوس کر دیا اور ان کو یقین ہو گیا کہ اب ان کی راہیں بالکل مسدود ہو گئی ہیں، فوج اقتدار سے چپٹی رہیگی

اور چونکہ فوج میں بنگالی نہ ہونے کے برابر ہیں لہذا ان کے لیے نجات اسی میں ہے کہ وہ علیحدہ ہو کر آزاد ہو جائیں۔ اس طرح فوج کی آمد نے اور فوج کی مداخلت نے تمام سیاسی رشتوں کو توڑ دیا۔

اس کتاب میں صرف تیرہ حضرات کی ملاقاتیں مختصراً قلم بند کی گئی ہیں بعض دشواریوں کے سبب سب ملاقاتوں کا احوال لکھنا اس کتاب میں ممکن نہیں تھا۔ لیکن حالات نے اگر مہلت دی تو انشاء اللہ دیگر ستر اسی حضرات کی ملاقاتوں کا احوال دوسری جلدوں میں محفوظ کر دیا جائے گا۔

آخر میں ان لوگوں کے لیے اظہار تشکر مجھ پر لازم ہے جنہوں نے میری علمی کاوش میں حتی الوسع مدد و اعانت فرمائی۔ یہاں پر قومی اسمبلی کی لائبریری کے منتظمین خصوصاً نعیم صاحب کے تعاون کا ذکر نہ کرنا ناشکری گردانا جائے گا جنہوں نے ضروری کتب کی فراہمی میں ہر ممکن مدد کی۔ ڈیپارٹمنٹ آف آرکائیوز کے منتظمین کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے قائداعظم کی دستاویزات کے مطالعہ کی سہولت فراہم کی۔ البتہ میری گزارش ہے کہ فوٹو سٹیٹ کی سہولت کے سلسلہ میں منتظمین کو اپنی پالیسی قومی مفاد میں بدلنی چاہیئے ورنہ اس ادارہ کی افادیت مشکوک ہو جائے گی۔

میں اپنے احباب خصوصاً سید رضوان حسین، پروفیسر انور بیگ اعوان، ڈاکٹر نعیم قریشی، سید مظفر حسین زیدی اسسٹنٹ کمشنر، پروفیسر احمد جاوید، مولانا حسین عارف نقوی، پروفیسر محمد صغیر قریشی، دربار علی شاہ سابق کمشنر، محمود علی سابق مرکزی وزیر اور میجر جنرل سید شجاعت علی بخاری کا بڑا ممنون ہوں جنہوں نے اس علمی سرگرمی کے نازک مرحلوں میں میری ہمت بڑھائی اور حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیا۔ نیز میں اپنے دوست ہومیو پیتھ ڈاکٹر ظفر احمد کا بے حد ممنون ہوں جن کے علاج کے طفیل میری بیماریاں کافور ہوتی رہیں۔

آخر میں اپنے چھوٹے بھائی سید محمد سیدین زیدی اور سید محمد شبیہ الحسنین زیدی کیلئے دعا گو ہوں۔ جو میرے ساتھ دوش بدوش زندگی کی صعوبتوں کا مقابلہ کرتے رہے، میں اپنے جگر گوشوں سیدہ فرح زینب بلبل، سیدہ وجیہہ زینب ماشاجی، سیدہ ثمانہ زینب گلگی اور سید عمّار علی ماؤ بلاّ، سید محمد شبّر بابگڑ بلاّ، سید محمّد علی علی جانا اور بھتیجے علی بادشاہ، سید کامران عونی بادشاہ کا بڑا مدّاح ہوں جنہوں نے غل غپاڑہ مچانے میں اپنے آپ کو قابو میں رکھا اور مجھے وقت میسر ہو سکا۔ میری ان کاوشوں کو کامیاب کرنے میں اہلیہ محترمہ کا بڑا دخل ہے جنہوں نے گھر کی الجھنوں سے بچائے رکھا۔

نیز میری بھتیجی سیدہ قرۃ العین عینی وسیدہ کاشفہ نے کتاب کی ترتیب اور پروف ریڈنگ میں میری خاص مدد کی، ادارہ کے جناب شفقت امین صاحب اور جناب محمد عظیم بھٹی صاحب نے کتاب کی طباعت میں جس محنت اور خلوص سے مدد کی میں ان کا ممنون ہوں۔ محترمہ ڈاکٹر مس کنیز یوسف صاحبہ نے کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں جس علم دوستی اور علم افروزی کا مظاہرہ فرمایا ہے اور کتاب پر ایک بصیرت افروز پیش لفظ تحریر فرما کر مجھے زیر بار احسان کیا ہے اس کے لیے میں انکا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

سید محمد ذو القرنین زیدی
اسسٹنٹ پروفیسر فیڈرل گورنمنٹ کالج نمبر ۲
H - 9 - اسلام آباد - پاکستان

(۱۵ فروری ۱۹۸۶ء)

جناب حسین امام صاحب

جناب حسین امام کا تعلق ہندوستان کے صوبہ بہار سے تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ سنٹرل ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔ ہندوستان میں اکیس سال تک انڈین لیجیلیٹو اسمبلی کے رکن رہے، پاکستان بننے کے کئی سالوں کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی میں مقیم ہو گئے تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے معتمد رفقاءِ کار میں سے ایک تھے۔ جناب حسین امام صاحب کی بیان کردہ روایات پاکستان کی تاریخ کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ مجھے کئی بار آپ سے ملنے کا موقعہ ملا۔ ملاقاتوں کا مختصراً حال نذرِ قارئین کر رہا ہوں۔ ۱۹۷۴ء میں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

قائد اعظم سے پہلی ملاقات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے حسین امام صاحب نے فرمایا کہ ساٹھ سال قبل ۱۹۱۴ء میں لندن میں مقیم تھا، وہ زمانہ کانگرس کے ساتھ پیار و محبت کا زمانہ تھا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی مرتبہ میری ملاقات مسٹر محمد علی جناح سے ہوئی تھی جہاں وہ ہندوستانی طلباء کی تنظیم کے قیام کے لیے کوشاں تھے۔ کیسل ہال میں ملاقات ہوئی جہاں پر بڑی کثیر تعداد میں ہندو اور مسلم طلباء موجود تھے۔ جناح صاحب کے ہمراہ اس وقت مسز سروجنی نائیڈو تھیں جو کہ بلبلِ ہند کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ یہ

وہ زمانہ تھا جبکہ مسلم لیگ اور کانگریس اپنے اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش میں سرگرم عمل تھیں اور ان کی مشترکہ کوششوں کے نتیجہ میں ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ نے جنم لیا۔ پھر اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے موقعہ پر الہ آباد میں ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں مسٹر جناح جداگانہ انتخابات کے موقف سے چند شرائط پر دست بردار ہونے کے لیے تیار تھے۔ اگر مسلمانوں کو ان کی نشستوں کا تحفظ مرکزی اور صوبائی سطح پر اور کابینہ میں مل جائے تو پھر وہ جداگانہ انتخابات کے اصول کو خیرباد کہنے کے لیے تیار تھے۔ رائونڈ ٹیبل کانفرنسوں کے بعد جناح صاحب نے کمیونل ایوارڈ کو منظور کر لیا تھا مگر کانگریس نے اس کو رد کر دیا تھا، اس وقت حکومت اور لیگ متحد ہو گئے جس کے نتیجہ میں کانگریس کو شکست کھانی پڑی لیکن جب فیڈریشن کا سوال پیدا ہوا تو کانگریس اور لیگ نے رد کر دیا۔

تقسیم ملک پر روشنی ڈالتے ہوئے حسین امام صاحب نے فرمایا کہ اگر ہمیں پورا بنگال و آسام اور پورا پنجاب مل جاتا تو ہم کروڑ ہندو ہمارے پاس ہوتے اور دو کروڑ مسلمان ہندوؤں کے پاس ہوتے، لیکن جس طرح تقسیم ہوئی اس کے نتیجہ میں ڈیڑھ کروڑ ہندو ہمارے پاس تھے اور تین چار کروڑ مسلمان انڈیا میں رہ گئے مگر اس صورت کو قبول کیے بغیر کوئی اور چارہ نہ تھا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ تو کل پنجاب کل آسام، کل سندھ اور صوبہ سرحد کا تھا۔ اس صورت میں چار کروڑ ہندو ہمارے ماتحت رہتے اور صرف دو کروڑ مسلمان ہندوستان میں رہ جاتے تھے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی دلیل یہ تھی کہ اگر آپ تقسیم چاہتے ہیں تو تقسیم کا اصول آخری حد تک جائے گا، جن علاقوں میں آپ کی اکثریت ہے وہ علاقے آپ کے ہوں گے جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے یا برابر ہیں وہ ہندوؤں کے پاس جائیں گے۔ اگر آپ اس بات پر راضی نہیں تو پھر ہم اختیارات صوبائی حکومتوں کے حوالے

کر کے چلے جائیں گے۔

۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور پر تبصرہ کرتے ہوئے حسین امام صاحب نے فرمایا کہ اس وقت ہم لوگوں کے سامنے آئین کے دو ہی نمونے تھے۔ ایک روسی آئین تھا جو کہ لینن نے ۱۹۲۲ء میں اپنایا تھا، اس سے ہم لوگ گریزاں تھے، کیونکہ ہم لوگ نہ کمیونسٹ تھے اور نہ ہی ہمارے نظریات کارل مارکس سے متاثر تھے، دوسرا نمونہ امریکہ کے آئین کا تھا جس میں ریاستوں کے الحاق کا تصور تھا۔ عام لوگ ان پیچیدگیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اگر امریکہ کی تحریکِ آزادی کا مطالعہ کیا جائے تو آپ کو علم ہوگا کہ وہاں برطانوی نوآبادیاں جزوی آزادی کی طلب گار تھیں مگر واقعات اس قدر تیزی کے ساتھ بدلے کہ نوآبادیوں نے اپنے آپ کو برطانیہ کی محکومی سے آزاد کرا لیا۔ جو کہ ایک عملی جدوجہد کا نتیجہ تھا، اس طرح وہ نوآبادیاں پہلے برطانیہ کے غلبہ سے آزاد ہوئیں پھر انھوں نے رضاکارانہ طریقہ سے اپنے آپ کو ایک فیڈریشن میں سمو لیا۔ جس میں مرکزی حکومت کو خاص خاص معاملات میں اختیارات سونپ دیے گئے اور باقی معاملات میں انہوں نے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ چونکہ ہم لوگوں کی تعلیم و تربیت انگریزی طرز اور فکر پر تھی اس لیے نظریاتی طور پر اور فکری طور پر ہم امریکہ سے زیادہ قریب تھے، ہمارے لیے امریکی آئین اور ان کا طرزِ فکر باعثِ تقلید تھا۔ برخلاف اس کے ہم سوویٹ (SOVIET) کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ برطانوی ہند میں انتظامی یونٹ صوبے تھے جن کو ہم امریکی ریاستوں سے تشبیہ دے رہے تھے، لہٰذا اس قرارداد کی تشکیل کے وقت شعوری اور لاشعوری طور سے ہم لوگ امریکی آئینی تصورات سے متاثر تھے۔ ہم نے ریاستوں کا لفظ قرارداد میں اسی وجہ سے شامل کیا۔

اس وقت یہ تصوّر بھی محال تھا کہ ہم کو ایک الگ ملک بھی مل جائے گا جہاں ہم حکومت کر سکیں گے۔ امریکہ میں تو تیرہ ریاستیں موجود تھیں۔ جن پر برطانیہ کا تسلط تھا

وہ ایک زبردست عملی جدوجہد میں مبتلا تھیں کہ کسی طرح غلامی کا جُوا اپنے گلے سے اتار پھینکیں، مگر ہمارے یہاں اس قسم کی کیفیت موجود نہیں تھی بلکہ حقیقتاً اس وقت ہم رومانی تصورات کا شکار تھے اور یہ تصور کہ ہم غلامی سے آزاد ہو کر اپنی حکومت کریں گے بڑا سحر آفرین اور فرحت بخش احساس تھا، لہٰذا حقیقتوں اور تصورات کو اکٹھا کر کے یہ الفاظ قرارداد کی شکل میں ڈھال دیے گئے تھے۔

خود مختار، آزاد اور متحدہ بنگال کی تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب حسین امام نے فرمایا کہ سہروردی صاحب چاہتے تھے کہ بنگال ایک علیحدہ خود مختار یونٹ ہو۔ ان کی اس کاوش میں سرت چندر بوس صاحب بھی شریک، شہید[1] اور سورت چندر بوس ہم لوگوں کے یہاں جمع ہوتے تھے۔ قائداعظم نے شہید سے کہا تھا کہ آپ کانگرس کی مرضی حاصل کر لیں پھر میرے پاس آئیں، لیکن کانگرس نے اس تجویز کی منظوری نہیں دی، یہ آج جو بنگلہ دیش بنا ہے اس کو وہ بڑا بنگلہ دیش بنا رہے تھے۔ مسلم لیگی حلقوں میں اس تحریک کی وجہ سے کبیدگی ضرور تھی۔ شہید چاہ رہے تھے کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے رہیں۔

لیاقت ڈیسائی پیکٹ کے بارے میں بات کرتے ہوئے حسین امام صاحب نے فرمایا کہ قائداعظم نے لیاقت علی سے کہا تھا کہ مجھ سے بات کیے بغیر آپ نے یہ پیکٹ کیوں کیا؟ اس پر لیاقت نے کہا کہ میں اس الجھن میں آپ کو پھانسنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے کندھوں پر یہ ذمہ داری اٹھائی۔ آپ کو بچانے کے لیے'

---

[1] حسین شہید سہروردی صاحب قبل از تقسیم متحدہ بنگال کے وزیراعظم تھے اور بنگال میں مسلم لیگ کے روحِ رواں وہ تھے جس طرح سندھ میں مسلم لیگ کو جی ایم سید صاحب نے پروان چڑھایا اور اس کو مقبولِ عام بنایا اسی طرح بنگال میں سہروردی صاحب کی خدمات تھیں۔

لیاقت علی خاں کی یہ دلیل سُن کر قائداعظم کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ حق یہ ہے کہ قائداعظم اتنے آئینی انسان تھے کہ میری زندگی میں ایسا کوئی دوسرا فرد دیکھنے میں نہیں آیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو میں بھی بہت خوبیاں تھیں مگر وہ بڑے جذباتی انسان تھے۔ قائداعظم بالکل ٹھنڈے تھے برف کی مانند اور ایسے مضبوط اعصاب کے مالک تھے جیسے کہ فولادی انسان ہو۔

قبلہ مولانا حسرت موہانی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب حسین امام صاحب نے فرمایا کہ وہ پاکستان کی مجوزہ تجویز کو قبول کرنے کے مخالف تھے، ان کا موقف یہ تھا کہ ہمیں لنگڑا لُولا پاکستان قبول نہ کرنا چاہیئے اور مکمل پاکستان کے حصول کے لیے لڑنا چاہیئے۔ انہوں نے مجوزہ تجویز کی مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں پرزور مخالفت کی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ جناب حسین امام نے فرمایا کہ مسلمان جذباتی ہوتے ہیں آگے پیچھے نہیں دیکھتے۔

جناب حسین شہید سہروردی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوتے جناب حسین امام صاحب نے فرمایا کہ کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس[۱] میں شہید نے کہا تھا۔ کہ بدلے ہوتے تقاضوں اور حالات کے پیشِ نظر مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ عوامی لیگ بنانی چاہیئے جس میں پاکستان کے تمام لوگ شرکت کر سکیں، لیکن اس زمانے میں سہروردی ناپسندیدہ شخصیت بن گئے تھے۔

ہر شخص کے ساتھ کچھ نہ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں، میں پاکستان بننے کے چار سال بعد پاکستان میں آیا جبکہ میرے اہلِ خانہ تیس دن بعد آ گئے تھے۔ میں اور نواب

---

[۱] یہ اجلاس ۱۴ اور ۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح صدر تھے یہ آل انڈیا مسلم لیگ کا آخری اجلاس تھا۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ ختم کر دی گئی تھی اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

اسمٰعیل خاں ہندوستان ہی میں رہے ہے۔ تقسیم کے بعد شہید ہندوستان میں رہ گئے تھے انہوں نے مسلمانوں کو بربادی سے بچانے کے لیے بڑے کام کیے، وہ اس زمانہ میں گاندھی جی کے ساتھ شریک سفر ہو گئے تھے۔ انہیں پاکستان میں لفٹ نہیں ملی۔ اور لفٹ کا مسئلہ جدید بھی ہے اور قدیم بھی۔ تقسیم سے قبل مسلمان واقعی ایک ہو گئے تھے، علاقائی تعصبات قومی جذبہ کے تحت معدوم ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کی ملازمتوں کے لیے غلام محمد صاحب نے سب سے زیادہ خدمت گزاری کی، گو وہ پکّے اور سخت قسم کے پنجابی تھے لیکن جب مسئلہ کسی جگہ ہندو اور مسلمان کا ہوتا تو وہ ہمیشہ مسلمان کا ساتھ دیتے تھے اور جب مسئلہ ایک مسلمان اور ایک پنجابی مسلمان کے درمیان ہوتا تو وہ ہمیشہ پنجابی مسلمان کی حمایت کرتے تھے۔

مسلم لیگ میں اگر تقسیم کی جاسکتی تھی تو اس کے تین نمایاں حلقے بنتے تھے، ایک حلقہ میں "جی حضوری" تھے۔ دوسرے حلقہ میں وہ حضرات تھے جو موقعہ و محل کے اعتبار سے "ہاں" یا "نا" کرتے تھے اور پھر ایک چھوٹا حلقہ ان حضرات پر مشتمل تھا جو ہمیشہ بلاشبہ اختلافی حلقہ تھا جس میں مولوی فضل الحق کے بعد ایک دو حضرات آتے ہیں۔ ان حضرات کو قائداعظم سنٹرل ورکنگ کمیٹی میں ایک مدت کے لیے رکھتے تھے۔ خلیق الزماں نواب اسمٰعیل خاں اور ہمارا ایک ہی گروپ سے تعلق تھا۔ اس میں کچھ حد تک مولانا ظفر علی خاں بھی آتے ہیں۔ قائداعظم اپریل ۱۹۴۸ء میں غلام محمد کو وزیر اعظم بنانا چاہتے تھے، یہ بات ہم نے سنی ہے۔ قائداعظم قابل آدمی کی تلاش میں تھے، ان کی نگاہ میں مسلم لیگی اور غیر مسلم لیگی کی اتنی اہمیت نہ تھی جتنی قابلیت اور اہلیت کی۔ کانگرس پارٹی نے بھی ایسا ہی کیا تھا کئی موقعوں پر۔ سر فضل حسین کی نگاہ میں ایک ہندو زیادہ قابل قدر تھا نسبتاً ایک غیر پنجابی مسلمان کے۔

نواب آف قلات جناب احمد یار خاں گورنر بلوچستان

احمد یار خاں ۱۹۰۴ء میں لورالائی میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۳۳ء
میں گدی نشین ہوئے۔ جناب احمد یار خاں ریاست قلات کے والی تھے
قیامِ پاکستان سے قبل قائد اعظم ریاست قلات کے سرکاری وکیل تھے
والیٔ قلات احمد یار خاں صاحب کا قائد اعظم سے بہت قریبی تعلق تھا
جناب احمد یار خاں صاحب نے قائد اعظم کو ۱۹۴۵ء میں سونے اور
چاندی میں تولا تھا۔ جناب احمد یار خاں صاحب بڑے علم دوست اور
صاحبِ بصیرت انسان تھے۔ ان کی ایک کتاب جو بلوچستان کی تاریخ
پر مشتمل ہے۔ ہمارے قومی تاریخی سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے
بھٹو دور میں وہ بلوچستان کے گورنر بھی رہے ہیں۔ ۱۹۷۴ سے لے کر
۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک مجھے ان سے ملنے کا کئی بار شرف حاصل ہوا ہے
ان ملاقاتوں کا مختصر حال سپردِ قلم کر رہا ہوں، یہ ملاقاتیں ۱۹۷۵ء میں
شروع ہوئی تھیں۔ آپ کی وفات ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ہوئی ہے۔

قائد اعظم محمد علی جناح سے اپنے تعلقات کے بارے میں بیان کرتے ہوئے
جناب احمد یار خاں صاحب نے فرمایا۔ کہ قائد اعظم میرے ساتھ چھ چھ گھنٹے باتیں کرتے

رہتے تھے۔ لیاقت علی خاں صاحب اور عبدالرب نشتر صاحب نے کئی دفعہ کہا کہ آپ اور خان صاحب جو بات چیت کرتے ہیں، نہ خان صاحب کچھ بتاتے ہیں نہ آپ کچھ کہتے ہیں۔ کئی کئی گھنٹے آپ باتیں کرتے ہیں؟ اس کے جواب میں قائداعظم نے فرمایا کہ یہ بات آپ ہم پر چھوڑ دیجئے۔ خان صاحب نے فرمایا۔ کہ ایک دفعہ چھ ہفتوں تک وہ میرے مہمان رہے، جس دن وہ تشریف لائے میں نے ان کا وزن کرایا اور جس دن وہ رخصت ہوئے اس دن پھر ان کا وزن کرایا۔ ان چھ ہفتوں کے قیام کے دوران میں قائداعظم کا وزن ۱۴ پونڈ بڑھ گیا تھا۔

جب پاکستان قائم ہو چکا تو قائداعظم نے مجھے کراچی بلایا، میں ۲۲ دنوں تک ان کا مہمان رہا۔ اس قیام کے دوران میں قائداعظم نے فرمایا: "کہ میں اس ملک کا چلانے والا نہیں ہوں۔ خدا گواہ ہے، وہ کہتے تھے دیکھو خان! میرے عزیز نوجوان! میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں، تم آؤ اور میری مدد کرو۔ اس ملک کو چلانے کے لیے قابل آدمیوں کی ضرورت ہے۔" اس کے جواب میں میں نے قائداعظم سے کہا۔ کہ اگر یہ بات ہے تو پھر میری کچھ شرائط ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ الیکشن کرا دیں، انتخابات آپ کی زندگی میں ہو سکتے ہیں بعد میں نہیں۔ پاکستان کا آئین بنا دیں اور پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دیدیں۔

یہ سن کر قائداعظم نے فرمایا۔ کہ یہ میں کیسے کر سکتا ہوں۔ اس پر جناب احمد یار خاں صاحب بولے کہ جس طرح میں نے اپنی ریاست قلات میں کیا ہے، میری ریاست میں اسلام ہے میں دس سال سے اسے چلا رہا ہوں۔ آپ بھی اسی طرح کریں۔ یہ سن کر قائداعظم بولے کہ وہ آپ کی ریاست ہے۔ پاکستان میری ریاست نہیں ہے پاکستان میں مختلف الخیال لوگ ہیں، ان کی اپنی ایک آئین ساز اسمبلی ہے۔ اسمبلی کو آئین سازی کا پورا اختیار ہے۔ مجھے اختیار نہیں ہے، البتہ اسمبلی جو قانون چاہے بنائے۔ یہ اس کا دائرۂ اختیار ہے۔ جواباً میں نے کہا۔ کہ آپ کی موجودگی میں آئین بن سکتا ہے، آپ کے

بعد یہ ناممکن ہے، آپ کے بعد کوئی جناح پیدا نہیں ہوگا، اس گفتگو کے بعد میں قلات واپس چلا آیا۔

احمد یار خاں صاحب سے ایک دفعہ قائد اعظم نے گفت گو کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ میں تین محاذوں پر جنگ لڑ رہا ہوں۔ ایک طرف ہندو ہیں، دوسری طرف انگریز ہیں، اور تیسری طرف غدار مسلمان ہیں جو کانگرس کے زیر اثر ہیں۔ وہ لوگوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ لوگوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ بقول احمد یار خاں کے ان کو یہ بھی علم تھا کہ کون کون لوگ ایمان دار ہیں اور کون کون بے ایمان ہیں، وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ اچھا آدمی تو اچھا ہوتا ہی ہے، آپ کی قابلیت یہ ہے کہ خراب آدمی سے بھی کام لیں۔ میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ ایک ایک آدمی سے کام لوں، مجھے ایک ایک مسلمان درکار ہے۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمان بڑی کٹھن آزمائش سے دوچار تھے قائداعظم کو اس بات کا یقین کامل تھا۔ کہ ہندوستان کو متحد کرنے والا اور کوئی نہیں سوائے ان کی واحد ذات کے۔ وہ بار بار یہی فرماتے تھے کہ میرا کام پاکستان کو حاصل کرنا ہے۔ چلانا نہیں۔ چلانے والے اور لوگ ہوں گے۔ میں تو اس کو حاصل کرنے والا ہوں۔ وہ فرماتے تھے کہ میں نہ تو کوئی بادشاہ ہوں، نہ کوئی فوجی آمر ہوں کہ میں لوگوں کو سزائیں دوں مجھے کسی کو ادھر کرنا ہے کسی کو اُدھر۔ اس طرح معاملات کو درست کرنا ہے۔ بقول احمد یار خاں صاحب کے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو اکٹھا کرنا اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا انہی کی شخصیت کا کمال تھا۔ میں ان کو داد دیتا ہوں کہ اتنی بڑی بڑی رکاوٹوں کے باوجود انہوں نے مسلمانوں کو منظم کر دیا تھا۔ اس وقت لوگوں میں اتنی محبت اور رواداری پیدا ہو چکی تھی کہ نہ کوئی اپنے آپ کو پٹھان کہلواتا تھا نہ پنجابی، نہ بنگالی، جو لوگ مسلم لیگ میں تھے سب اپنے آپ کو ایک ہی سمجھتے تھے۔ وہ بڑی دور بینی کے ساتھ مسلمانوں کے مستقبل کو دیکھ رہے تھے۔ ہر علاقہ میں اور ہر طرف سامراج سے آزاد

ہونے کی امنگ مچل رہی تھی، پنجاب میں، بنگال میں، آسام میں، سندھ میں، صوبہ سرحد میں ہر طرف بیداری کا ایک طوفان بپا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مشترکہ اور متحدہ جدوجہد ہی سے آزادی مل سکتی ہے۔ سب علاقے اپنی ثقافتی حیثیت کو برقرار بھی رکھیں اور آزادی بھی حاصل کر لیں، اپنے اپنے گھروں میں سب خوش ہوں اور ایک دوسرے سے مل کر بھی خوش رہیں۔

مسلم لیگ کے بارے میں قائد اعظم کے خیالات پر روشنی ڈالتے ہوتے احمد یار خاں صاحب نے فرمایا۔ کہ پاکستان بننے کے بعد قائد اعظم کا نظریہ مسلم لیگ کے بارے میں بدل گیا تھا، وہ مسلم لیگ کو برقرار رکھنے کے حق میں نہیں تھے وہ اس کو خدا حافظ کہنا چاہتے تھے۔ میں ان کے اس خیال سے متفق نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کانگرس کی طرف دیکھیں ہندوؤں نے اس کو پکڑا ہوا ہے۔ لیکن اگر آپ نے مسلم لیگ کو چھوڑ دیا تو ہمارے پاس اور کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے۔ اس پر بقول احمد یار خاں صاحب کے قائد اعظم نے فرمایا کہ مسلم لیگ جس مقصد کے لیے بنی تھی وہ مقصد تو حاصل ہو چکا ہے! اب اور سیاسی جماعتیں آئیں۔ مسلم لیگ کو آزاد چھوڑ دینا چاہیئے۔ خان آف قلات مسلم لیگ کو خدا حافظ کہنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے برطانیہ کی لیبر پارٹی اور کنزرویٹو پارٹی کی مثالیں بھی پیش کیں لیکن قائد اعظم اس بات پر مصر تھے کہ جبکہ مسلم لیگ نے اپنا مقصد یعنی پاکستان کا حصول پورا کر لیا ہے تو اب اس پارٹی کی ضرورت بھی نہیں رہی اور اب اور جماعتوں کو میدان میں آنا چاہیئے۔

بلوچستان مسلم لیگ کے بارے میں خان صاحب نے فرمایا۔ کہ بلوچستان میں مسلم لیگ کی آبیاری قاضی عیسیٰ نے کی، میں تو اپنی ریاست کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ لیکن قاضی عیسیٰ صاحب نے مسلم لیگ کے لیے بڑا کام کیا۔ گو قائد اعظم کے تعلقات قاضی عیسیٰ صاحب سے کشیدہ ہو گئے تھے۔ قاضی عیسیٰ کا جھکاؤ خان لیاقت علی خاں کی طرف

تھا۔ قاضی عیسیٰ کی یہ توقع تھی کہ ان کو کابینہ میں لیا جائے گا۔ بلوچستان کی طرف سے ایک آدمی ہونا چاہیئے وہ اپنے آپ کو اس کے لیے موزوں ترین سمجھتے تھے۔ مگر تقسیم ہند سے قبل قائداعظم اور ان کے مابین کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ایک ذاتی معاملہ تھا جس کا تعلق قاضی عیسیٰ کی نجی زندگی سے تھا۔ قاضی عیسیٰ کو یہ اعتراض تھا کہ قائداعظم کو ان کے ذاتی معاملے میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے۔ وہ قاضی عیسیٰ سے اس حد تک ناراض ہو چکے تھے کہ انہوں نے مجھے بذریعہ تار کراچی بلایا لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت تھی، کہ میں اپنے ہمراہ قاضی عیسیٰ کو لے کر ان کے گھر کی حدود میں داخل نہ ہوں۔ قائداعظم کا یہ خیال تھا کہ جو آدمی میرے ساتھ کام کرے گا اس کو میری ہی پیروی کرنی چاہیئے۔ ایک وقت میں اگر دو ماسٹر ہوں گے تو کام خراب ہوگا۔

قائداعظم اور لیاقت علی خاں کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے خان صاحب نے فرمایا کہ مجھے سردار عبدالرب نشتر نے پشتو میں بتایا کہ بابا اور لیاقت علی کے درمیان کچھ اختلافات ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں کون حق بجانب ہے؟ اس پر سردار صاحب نے کہا۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! یہ تو گستاخی ہوگی کہ ہم قائداعظم کے سامنے کسی اور آدمی کو لائیں۔ وہ صحیح کہیں یا غلط بس سر تسلیم خم ہے۔ تعلقات کی اس خرابی میں سکندر مرزا، چودھری محمد علی اور کرنل شاہ وغیرہ کا کافی ہاتھ تھا۔ ان لوگوں نے قائداعظم اور لیاقت علی خاں کے مابین اختلافات کے بیج بوئے۔ پھر عورتوں میں اختلافات تھے بیگم لیاقت علی خاں مس جناح سے آگے نکلنا چاہتی تھیں۔ لیاقت علی خاں صاحب نے مجھے خود یہ بات بتائی کہ آپ کو معلوم ہے کہ بڑے میاں مجھے بنگال بھیج رہے تھے۔ میں نے کہا کہ میں نے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ دو ہی تو آدمی ہیں۔ ایک اس علاقہ کو سنبھالے اور دوسرا اس علاقہ کو۔ مگر لیاقت علی خاں یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کو لات مار کر باہر نکالا جا رہا ہے۔ گو قائداعظم کا یہ خیال نہیں تھا۔ البتہ وہ چاہتے تھے کہ نواب حمیداللہ خاں کو

جو کہ والیٔ بھوپال تھے، ہندوستان سے بلا کر کوئی ذمہ داری سونپی جائے، پنڈت نہرو اور حمید اللہ خاں میں بڑی دوستی تھی، میں نے اس خدشہ کا اظہار کر دیا تھا کہ نواب بھوپال پاکستان نہیں آئیں گے وہ وہاں رہ کر مسلمانوں کی بہتر خدمت کر سکیں گے۔

احمد یار خاں صاحب نے بتایا کہ تقسیم سے قبل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھے بلایا اور کہا کہ آپ جناح صاحب کے قریب ہیں آپ ہمارا یہ پیغام ان تک پہنچا دیں اور ان کا جواب بھی لا کر دیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ ہمارے پاس وقت کم ہے اور راہیں بھی محدود ہیں۔ ہم ایک یہ کر سکتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو اکثریت کے حوالے کر دیں اور مسلمان خود کانگریس کے ساتھ تصفیہ کر لیں۔ دوسری راہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان میں مزید تین سال رہیں۔ اس اثنا میں ہم دیکھیں گے کہ اگر ہندو اور مسلمان اکٹھا رہنا چاہتے ہیں تو رہیں، لیکن اگر اس دوران ہم نے دیکھا کہ اکٹھا رہنے کے امکانات نہیں تو پھر ہم انکے اور ہندوؤں کے درمیان سمجھوتہ کرا دیں گے۔ تیسری راہ یہ ہے کہ فوری طور پر آزادی دے دی جائے تو اس صورت میں بنگال اور پنجاب تقسیم ہو گا اور پورا پنجاب اور بنگال نہیں مل سکے گا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا یہ پیغام لے کر میں قائد اعظم سے ملنے کے لیے گیا۔ ان کو پیغام دیا۔ بخدا ان کے الفاظ تھے

"میرے عزیز نوجوان! یہ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ کیا انگریز ہندوستان کو چھوڑنے کے بارے میں مخلص ہیں؟ پھر مجھ سے فرمایا۔ کہ آپ اس میں کونسا راستہ اختیار کرنے کو ترجیح دیں گے۔"

میں نے اس وقت معذرت کا اظہار کر دیا اور کہا کہ میرے لیے یہ مشکل مسئلہ ہے تاہم شام کو اس مسئلہ پر گفت گو ہو سکتی ہے۔ قائد اعظم نے اس بارے میں سردار عبدالرب نشتر، لیاقت علی خاں، اسمٰعیل خاں اور چند دیگر صاحب سے تبادلۂ خیال کیا، دو دنوں تک اس مسئلہ پر بات چیت ہوتی رہی۔ پھر مجھے بلایا اور کہا کہ کیا آپ ہمارا پیغام اُن تک لے جا سکتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں! آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟۔ انہوں نے فرمایا کہ لشتر

نے تمام بات مجھ پر چھوڑ دی ہے۔ لیاقت علی خاں اور اسمٰعیل خاں کا یہ خیال ہے کہ یہ انگریز شیطان لوگ ہیں۔ اگر ہم ان کو موقعہ دیتے ہیں تو ممکن ہے کہ یہ پھر نہ جائیں یہیں رہیں اور ہمیں لڑاتے رہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ جو فیصلہ ہونا ہے فی الفور ہو جائے اس پہ میں نے کہا پھر تو آپ کو بہت گنوانا ہوگا۔ آپ کو پورا پنجاب نہیں مل سکتا میں نے کہا کہ پنجاب تقسیم ہوگا، بنگال تقسیم ہوگا اور صوبہ سرحد کا بھی مشکوک معاملہ ہے۔ غرضیکہ میں یہ پیغام لے کر واپس وائسرائے کے پاس پہنچا۔ دو تین دنوں کے بعد پھر وائسرائے سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ تم مسلمان بڑے جذباتی لوگ ہو آزادی تو ہم دے ہی رہے تھے، اس بات کا فیصلہ تو ہو چکا ہے، اب ہندوستان کو تقسیم کرنا ہے یہ سوال پارلیمنٹ میں آئے گا۔ لہٰذا وائسرائے نے پارلیمنٹ کو اطلاع کر دی کہ مسٹر جناح ہر حالت میں تقسیم مانگتے ہیں۔ اس کے بعد تین جون ۱۹۴۷ء کو آزادی کا اعلان ہو گیا۔

جب پاکستان قائم ہو گیا تو میں نے قائداعظم سے کہا کہ ملک کو دو بڑے مسئلے درپیش ہیں۔ ایک افغانستان اور دوسرا کشمیر۔ میں نے کہا کہ کشمیر کا مہاراجہ میرا دوست ہے۔ ہم آپس میں بہت بے تکلف ہیں۔ آپ ایک سفید کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ وہ کاغذ مہاراجہ کے پاس لے جاؤں گا۔ اس سے دستخط کرا لوں گا۔ جو کچھ وہ مانگتا ہے وہ ہم قبول کر لیں۔ کشمیر کو پاکستان میں آنا چاہیئے۔ آپ اس کو مجھ سے زیادہ عزت دیں اس سے ہمارا کام بنے گا، دوسرے افغانستان میں آپ سردار عبدالرب نشتر کو بہ حیثیت سفیر کے بھیجیں وہ بات چیت کر لیں گے۔ افغانستان انگریزوں کے جانے کے بعد ایک بفر اسٹیٹ کی حیثیت سے برقرار نہیں رہ سکے گا وہ قطعی طور پر روس کے رحم و کرم پر ہو جائے گا۔

قائداعظم کے روس کے بارے میں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے احمد یار خان

صاحب نے بتایا کہ قائداعظم کہتے تھے کہ روس ہم سے بہت قریب ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اگر روس ہمارے ساتھ ہو گا تو پھر ایران، افغانستان اور ہندوستان وغیرہ سے ہمیں مخالفت کا خطرہ کم ہو گا مگر وہ چاہتے تھے کہ ہم اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھیں۔ روس بھی ہے، امریکہ بھی ہے، انگریز بھی ہیں۔ یورپینز بھی ہیں۔ ہمیں تو سب سے اپنا مطلب نکالنا ہے۔ روس کو وہ پسند کرتے تھے۔ ان کے ذہن میں روس کی ترقی کا بڑا خیال تھا کہ کس طرح انہوں نے ترقی کی۔

وہ سید جمال الدین افغانی سے بڑے متاثر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تمام مسلمانوں کو اکٹھا کر کے ایک کنفیڈریشن میں لایا جائے۔ وہ اس بات کے حامی تھے کہ ایک کو جدا کر کے پھر اکٹھا کر دیا جائے، وہ اس کو زیادہ قابلِ عمل سمجھتے تھے ۱۹۴۹ء میں میں امریکہ گیا۔ واپس آکر میں نے امریکہ کی بڑی تعریفیں کیں تو لیاقت علی خاں صاحب نے مجھے کہا۔ بھائی خان! دونوں آنکھوں سے دیکھنا چاہیئے۔ ایک آنکھ سے مت دیکھو۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔

لیکن میرے اس استفسار پر کہ خان لیاقت علی خاں تو خود روس کو چھوڑ کر امریکہ تشریف لے گئے تھے۔ جناب احمد یار خاں صاحب نے جواباً فرمایا کہ امریکہ کے پاس ہر چیز موجود تھی، امریکہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کھول دیا تھا اور روس کے پاس تو کوئی چیز دینے کے لیے نہیں تھی۔ روس تو خشک دوستی چاہتا تھا۔ دونوں کو خوش رکھنا بڑا مشکل تھا۔ اب جب انہوں نے دیکھا کہ امریکہ امداد دے رہا ہے چلو ذرا اس کی طرف چلیں، امریکہ نے اپنی جیب کھول دی تھی۔ پاکستان کے لیے اس وقت امریکہ کی زیادہ ضرورت تھی لیکن لیاقت علی خاں کی پالیسی یہ تھی کہ ہم روس کو بھی پریشان نہ کریں اس وقت ہماری خارجہ پالیسی کا دارومدار امریکہ پر تھا ہم کسی اور کی طرف دیکھ نہیں سکتے تھے آخر ہم نے سب کچھ انگریزوں سے ہی حاصل کیا تھا۔ انگریز تو امریکہ کے بچے تھے، اس

وقت انگریز اور امریکہ ایک تھے، ہم پر ان دونوں کا اثر پڑتا تھا۔ اب امریکہ آقا تھا اور انگریز ان کے زیرِ اثر تھے۔ ہم دونوں کے خادم تھے۔ لہٰذا ہمارا قبلہ اینگلو امریکہ تھا۔

خان لیاقت علی خاں کے قتل پر روشنی ڈالتے ہوئے نواب احمد یار خاں نے فرمایا۔ یہ بہت گہرے اور اندرونی معاملات تھے۔ دراصل قائدِ اعظم کے مرنے کے بعد اندر ہی اندر افراتفری شروع ہو چکی تھی۔ ایک انتشار تھا جو جنم لے چکا تھا۔ ان کی اتنی بڑی شخصیت تھی کہ ان کے سامنے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ وہ مدلّل بات کرتے تھے قائدِ اعظم کے بعد حالات بگڑنے لگے، ایک طرف سروسز کے لوگ تھے۔ دوسری طرف سیاستدان تھے۔ سروسز[1] کے لوگ اپنے اقتدار کو آگے بڑھانے کی فکر میں تھے۔ لیاقت علی خاں نے معاملات کو سلجھانے کی کوششیں بھی کیں لیکن حالات بگڑتے گئے۔ اس کش مکش کا شکار لیاقت علی خاں ہو گئے۔ لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد گورمانی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ سردار عبدالرب نشتر وزیرِ اعظم ہو جائیں۔ گورمانی چاہتے تھے کہ ناظم الدین کو گورنر جنرل کی پوسٹ سے ہٹا کر ان کو وزیرِ اعظم بنا دیا جائے اور ان کی جگہ غلام محمد کو دے دی جائے۔ غلام محمد صاحب کو اسمبلی سے رجوع کیے بغیر کابینہ کی میٹنگ کر کے گورنر جنرل بنا دیا جائے۔ مجھے گورمانی صاحب نے خود یہ بات بتائی کہ کراچی میں مَیں نے واجد[2] سے کہا کہ آپ گاڑی میں بیٹھیں اور غلام محمد کے آنے سے پہلے ان کو بتا دیں کہ ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اب گورنر جنرل ہیں۔ اُس وقت غلام محمد پنجاب میں تھے اور گورمانی کراچی میں۔ اگر انتخاب کی بات اسمبلی پر چھوڑ دی جاتی تو خیال یہ تھا کہ نشتر صاحب کو وزیرِ اعظم منتخب کر لیا جاتا۔ مگر گورمانی یہ نہیں چاہتے تھے۔ دراصل گورمانی صاحب کو

---

[1] غلام محمد، گورمانی، قربان علی خاں، چودھری محمد علی، اسکندر مرزا، ایوب خاں، غلام احمد وغیرہ کا ٹولہ تھا۔
[2] امجد حسین صاحب، اسکندر مرزا کے دَور میں وزیرِ صنعت تھے۔

یہ علم تھا کہ ہم نے تو ایک کٹ پتلی شو جمانا ہے۔ سارا کام چلانا تو بالآخر ہم نے ہی ہے اس سلسلہ میں آپ اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ سکندر مرزا غیر منقسم ہندوستان میں نمبرا پولیٹیکل ایجنٹ تھے، جہاں بھی ان کی انگریزوں کو ضرورت پڑتی تھی وہاں بھیج دیتے تھے۔ سکندر مرزا نے گورمانی کو چت کیا۔ چودھری محمد علی کو پچھاڑا، سب کو لپیٹ کیا۔ لیکن ایوب خاں سے مات کھا گئے۔ ایوب خاں کو سکندر مرزا کی تمام حرکات کا علم تھا۔ ایوب خاں صاحب نے سکندر مرزا پر جاسوس چھوڑے ہوتے تھے وہ اس پہ نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ایوب خاں صاحب نے یہ بات مجھے خود بتائی کہ یہاں پہ جو تماشہ ہو رہا تھا اس کا مجھے بخوبی علم تھا کیونکہ سکندر مرزا کا ملٹری سیکرٹری میرا اپنا آدمی تھا۔ سکندر مرزا کی ہر صبح اور ہر شام کی اطلاع مجھے مل جاتی تھی۔ سکندر مرزا کس کس سے ملتے ہیں، کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ تمام گفتگو ریکارڈ کر لی جاتی تھی۔ مجھے سکندر مرزا صاحب کی ایک ایک حرکت کا علم تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ اب پانی سر سے اوپر گزر گیا ہے تو تب مجھے آنا پڑا۔

ملک میں صوبہ پرستی کی لعنت پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب احمد یار خاں صاحب نے فرمایا۔ کہ صوبہ پرستی کا زیادہ زور ون یونٹ کی تشکیل کے بعد شروع ہوا۔ ایک موقعہ پہ سکندر مرزا صاحب نے مجھ سے کہا کہ ہمارے بنگالی بھائی ہمیں تنگ کر رہے ہیں کہ ہم ون یونٹ بنانے پہ مجبور ہو گئے ہیں، اس پہ میں نے ان سے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کے خلاف صف آراء ہو رہا ہے۔ تو پھر کس طرح یہ تجربہ کامیاب ہوگا۔ اس پہ سکندر مرزا صاحب نے کہا کہ یہ پالیسی تو پستول کی پالیسی ہے۔ یہ بحث مباحثے کی نہیں۔ ہم نے یہ کرنا ہے اس لیے ضرور کر کے رہیں گے۔ ون یونٹ جب بنا تو بد قسمتی سے اس کو اس طرح نہیں چلایا جس طرح چلانا چاہیئے تھا۔ اگر لوگوں کی خوش حالی کے لیے کام کیا جاتا تو پھر صوبہ پرستی کا سوال ہی نہ اٹھتا۔

ایوب خاں کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے خان آف قلات نے فرمایا کہ میرے خیال میں ایوب خان صاحب سے دو چار بڑی غلطیاں سرزد ہوئیں جن کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایک بات تو یہ تھی کہ انہوں نے آمریت کو بڑا طول دے دیا تھا۔ وہ بذاتِ خود قابل انسان تھے لوگ ان کو پسند بھی کرتے تھے مگر انہوں نے جمہوری قوتوں کو دبایا اور فوجی آمریت کو ابھارا۔ یہ ان کی بڑی غلطی تھی۔ دوسرے یہ کہ جب وہ امریکہ تشریف لے گئے تو وہاں انہوں نے بڑی کھری کھری باتیں کیں۔ جس پر صدر کینیڈی صاحب نے کہا کہ آپ لوگوں کی ہر چیز کا دارومدار ہمارے اوپر ہے۔ اس پر آپ بڑی بڑی باتیں بھی کرتے ہیں۔ اس طرح امریکہ سے ہمارے تعلقات میں فرق پڑ گیا۔ پھر افغانستان اور ایران کا مسئلہ تھا۔ ایوب خاں صاحب نے افغانستان کے بادشاہ کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کیں جو پسند نہیں کی گئیں اس طرح ایران کے شہنشاہ کے بارے میں وہ فرماتے تھے کہ وہ تو خود ایک بادشاہ ہے مگر اپنے آپ کو شہنشاہ کہلواتا ہے۔ آخر اس کے ماتحت کتنے بادشاہ ہیں۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے ملک امیر محمد خاں کو اور بھٹو کو حکومت سے علیحدہ کر کے سخت سیاسی غلطی کی تھی۔

اپنی قائداعظم سے وابستگی کے بارے میں ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے خان صاحب نے فرمایا کہ قائداعظم نے اپیل کی تھی کہ مجھے پستول اور بندوق کی گولی نہیں چاہیئے۔ مجھے چاندی کی گولی چاہیئے۔ اس اپیل کے جواب میں مسلم لیگ تحریک کو تقویت پہنچانے کے لیے میں نے قائداعظم کو سونے اور چاندی میں تولا تھا مجھے یاد ہے کہ ان کا کل وزن ۱۴۰ پونڈ تھا جو سونا میں نے دیا وہ ۱۸۰ پونڈ تھا۔ یہ واقعہ میرے گھر کا ہے، اس وقت میں اس کی تشہیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چودھری نذیر احمد۔ لاہور

جناب چودھری نذیر احمد صاحب کا تعلق منٹگمری سے تھا۔ ان کا پیشہ وکالت تھا، پنجاب مسلم لیگ کے حلقوں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ وہ پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے بھی رکن تھے، تحریک پاکستان میں انہوں نے بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا تھا۔ جناب لیاقت علی خاں کے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں وہ مرکزی وزیرِ صنعت تھے۔ ۲۵ جنوری ۱۹۷۵ء میں میری ملاقات ان سے ان کی رہائش گاہ واقعہ گلبرگ میں ہوئی اس ملاقات کا حال سپردِ قلم کر رہا ہوں۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے چودھری نذیر احمد صاحب نے فرمایا کہ قائدِ اعظم ایک عجیب شخصیت کے حامل انسان تھے، وہ اقبال کا مردِ مومن بھی تھے اور مردِ شاہین بھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ مخلص کوئی اور شخص سیاست کے میدان میں نہیں دیکھا۔ ان کی صلاحیتیں بے پناہ تھیں۔ ان کا ذہن اتنا صاف تھا کہ مشکل سے مشکل مسائل کو بھی وہ بالکل آسان کر دیتے تھے، ان کے ذہن میں کوئی پراگندگی نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑی خوردبین کے ذریعے وہ مسائل کو دیکھ کر ان کی اولیت اور موزونیت کے اعتبار سے ان کو ان کے

صحیح مقام پر رکھ دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے مشکل ترین مسئلہ کے سمجھنے میں بھی آسانیاں پیدا ہو جاتی تھیں، وہ اپنی رائے کے اظہار میں بالکل بے باک تھے وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ کوئی ان کی بات کو پسند کرے گا یا نہیں، اگر وہ کسی چیز کو صحیح سمجھتے تو برملا صداقت کا اعلان کرتے، ان کو اس بات کا خوف نہیں تھا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ مجھے ان کو بارہا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان کے سامنے دیگر حضرات ایسا لگتے تھے جیسے جنّ کے سامنے بونے لگتے ہیں۔

ایک وہ شخص جس کے پچاس سال تک مسلمانوں سے کسی قسم کے مراسم تک نہ تھے جس نے شادی بھی کی تو ایک پارسی لڑکی سے، جس کو بعد میں مسلمان کیا اور جس کے تعلقات بھی ہندوؤں سے تھے، پارسیوں سے تھے، انگریزوں سے تھے اور رہائش بھی ایک ایسے مقام پر تھی جہاں ایک عام آدمی کی رسائی بھی نہ تھی یعنی مالا بار ہل۔ اس کا اس تمام عرصہ میں مسلمانوں سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ ہستی حاصلِ جمہور نکلی، لوگوں نے ان کو پسند کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو پسند فرمایا۔ وہ ایک مردِ مومن تھے۔ وہ خدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ تھے۔ وہ نہ نبی تھے نہ امام اور نہ ہی پیغمبر۔ لیکن بلا شبہ نہایت مخلص اور نہایت قابل انسان تھے۔ چونکہ خداوند تعالیٰ نے انہیں ایک کام کے لیے پسند کر لیا تھا تو کوئی ان کے مقابلے پر نہیں آ سکتا تھا۔ پروفیسر صاحب! اللہ کی دین کے طریقے بھی عجیب ہیں، وہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ خدا کی دین کا حال موسیٰؑ سے پوچھیے اقبال بھی انہیں لوگوں میں سے تھا جو خدا کے پسندیدہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی حقیقتیں ان پر آشکار کر دی تھیں۔ ان کا درجہ اتنا بلند ہے کہ منکرین میں سے کوئی ان کے نزدیک نہیں آ سکتا ہے۔ اقبال کے لنگوٹیے جو تھے ان میں سے چند ایک میرے بھی واقف ہیں مجھے یہ کہتے ہوئے ہچکچاہٹ آتی ہے کہ اقبال کی جوانی ایسی تھی جس کا ذکر نہ ہو تو اچھا ہی ہے لیکن اس شخص کو جس کی جوانی ایسی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام عالموں،

فاضلوں اور تہجد گزاروں پر ترجیح دی اور پسند فرمایا۔ جو کچھ وہ کہتے تھے وہ یقیناً الہامی تھا۔ ان کا درجہ اتنا بلند تھا کہ مفکروں میں کوئی بھی ان کے برابر نہیں تھا۔

چودھری نذیر صاحب نے قائداعظم کی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت بعض لوگ کہنے لگے تھے کہ قائداعظم نے جو یہ فرمایا ہے کہ ہندو اپنے مندروں میں جائیں، مسلمان اپنی مسجدوں میں اور عیسائی اپنے گرجوں میں وغیرہ۔ تو کیا یہ بات اسلامی نظریہ کے مطابق ہے؟

قائداعظم کی رائے کی مخالفت کرنا تو قریب قریب گناہ کے مترادف تھا لیکن اتنا مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ آپس میں بیٹھ کر یہ باتیں کرتے تھے کہ قائداعظم سے اس کے بارے میں بات چیت کریں گے کہ ان کا صحیح مطلب کیا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ قائداعظم نے اسلامی ریاست کے تصور کو ترک کر دیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ قائداعظم نے اسلامی ریاست کے تصور کو ترک تو نہیں کیا تھا اور نہ ہی انہوں نے اُس رنگ میں پیش کیا جس میں اقبال نے پیش کیا تھا۔ ابھی تک مسلمانوں کے وطن کے سلسلہ میں سارا نقشہ ذہن میں نہیں اترا تھا کیونکہ اس وقت گھمبیر مسائل پاکستان کو درپیش تھے جس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے اور پھر مسلمانوں کا اتنا قتل عام ہو رہا تھا جس کا قائداعظم کے دل اور دماغ پر بڑا اثر تھا۔ تو میرے خیال میں ابھی اسلامی ریاست کا نقشہ ان کے ذہن میں ابھرا نہیں تھا یا ان کو موقعہ نہیں ملا تھا کہ اس کو واضح کریں۔

آل پاکستان مسلم لیگ کے ایک تاریخی[1] اجلاس کی کارروائی کا حال بیان کرتے ہوئے چودھری صاحب نے فرمایا کہ اس موقعہ پر مسلم لیگ پارٹی دو واضح گروپوں میں بٹ گئی تھی۔

---

[1] یہ اجلاس فروری میں فریئر ہال کراچی میں ہوا تھا۔ یہ بات فروری ۱۹۴۸ء کی ہے۔

ایک گروپ کا خیال تھا کہ پارٹی کا عہدہ اور حکومت کی ذمہ داری ساتھ ساتھ نہ ہونی چاہئیں۔ جبکہ دوسرا گروپ اس خیال کا حامی تھا کہ پارٹی کا عہدہ اور حکومت کا عہدہ اکٹھا رہنا چاہیئے، اس مسئلہ پہ ہاؤس کے اندر کافی بحث مباحثہ ہوا تھا۔ اس موقعہ پہ مجھے قائداعظم نے ووٹ گننے پر مقرر فرمایا تھا۔ حسب حالات مخالف گروپ جیت گیا تھا۔* جلسہ کی کارروائی کے دوران ایک موقعہ ایسا بھی آیا جب قائداعظم ایک دم جلسہ چھوڑ کر ناراضگی کے عالم میں تشریف لے گئے۔ قائداعظم کے اس طرح چلے جانے سے ہم لوگوں کے اوپر ایک سناٹا چھا گیا تھا اور ہم لوگ بڑے حیران تھے۔

پھر چودھری نذیر صاحب نے قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے کی روداد سنائی۔ قراردادِ مقاصد کے سلسلہ میں جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اس میں ۱۲۔ اراکینِ اسمبلی شامل تھے۔ اس قرارداد کے بارے میں مسلم لیگ دو واضح گروپوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک گروپ وہ تھا جو کہتا تھا کہ اسلام کا صرف لبادہ پہنو اور ملک کو جدید مہذب جمہوری ریاست بناؤ۔ مذہب کا زیادہ دخل نہ ہو، لوگوں کو خواہ مخواہ اسلام اسلام کہہ کر نہ بھڑکاؤ۔ دنیا کیا کہے گی کہ اس زمانہ میں مذہب کے نام پر ریاست قائم کر رہے ہو۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اسلام کے نام پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ذبح نہ کرنے لگے۔ برخلاف اس کے دوسرا گروپ ان حضرات پر مشتمل تھا جو یہ کہتے تھے کہ اسلامی ریاست ہونی چاہیئے۔ لوگ نمازیں پڑھیں۔ اللہ کے سامنے سجدے کریں، ان کے دل میں خوفِ خدا ہو۔ ان حضرات میں سرگرم اراکین ڈاکٹر عمر حیات خاں تھے اور میں تھا مجھے یاد ہے کہ اس رات یہ چیلنج دے دیا گیا تھا کہ آج اس مسئلہ پر فیصلہ ہو جانا چاہیئے

---

* قائداعظم کا موقف یہ تھا کہ مسلم لیگ کا عہدہ اور حکومت کا عہدہ اکٹھے رہنا چاہیئے۔ مگر ہاؤس نے اس خیال کو مسترد کر دیا تھا۔

لہٰذا اجلاس رات کو ساڑھے نو بجے شروع ہوا۔ ہم لوگ کھانا کھا کر آئے تھے۔ مسٹر لیاقت علی خاں نے بھی کہا تھا کہ اس سوال کو طے ہو جانا چاہیئے۔ یہ اجلاس رات کے پونے تین بجے تک چلتا رہا، میری تقریر کی باری آخر میں آئی، اس وقت تک کافی بحث ہو چکی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے کہا کہ جناب صدر اس وقت رات کے تین بجنے والے ہیں۔ سب تھکے ہوئے ہیں۔ کافی بحث ہو چکی ہے۔ میں حصہ نہیں لے سکتا

میں نے کہا تھا۔ کہ اگر اس پر عمل ہوا تو ایک اچھی اسلامی ریاست ابھرے گی۔

قرار دادِ مقاصد کی مخالفت غلام محمد صاحب کر رہے تھے۔ ان کی عادت تھی۔ وہ موچی دروازے والوں کے طور طریقے اختیار کرتے تھے۔ جہاں بیٹھے وہیں کسی کی ٹانگ کھینچ دی۔ کسی کو گالی دے دی، کسی کا مذاق اڑا دیا، وہ اکثر ایسا کیا کرتے تھے۔

خان لیاقت علی خاں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے چوہدری صاحب نے فرمایا۔ کہ قائدِ اعظم کے بعد صرف لیاقت علی خاں ایسے شخص تھے جو قوم کو درست راستے پر ڈال سکتے تھے۔ مگر افسوس قوم نے ان کو موقعہ نہیں دیا۔ اس کے متعلق میرے شکوک ہیں کہ ان کو سازش کے ذریعہ قتل کرایا گیا اور سازش بیرونی بھی تھی اور اندرونی بھی۔ سازشی یہ سمجھتے تھے کہ لیاقت علی خاں کا قد اتنا لمبا ہو گیا ہے کہ جب تک وہ زندہ ہیں اس وقت تک ان کو وہ طاقت اور اختیارات نہیں مل سکتے جو وُہ چاہتے تھے۔ لیاقت علی خاں نے لوگوں سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے منتظم اور سیاست دان ہو کر ابھرے تھے۔ اب تو ان کے قتل کے بارے میں شہادتیں بھی نہیں رہیں، شکوک و شبہات ہیں۔ لیکن میرا یقین ہے کہ لیاقت علی خاں کا قتل سازش کا نتیجہ تھا۔ ان کے قتل کے بعد سازشی ٹولہ برسرِ اقتدار آ گیا اور انہوں نے ایک ایسے آدمی کو اپنا آلۂ کار بنایا جو حقیقتاً نیک آدمی تھا۔ یعنی خواجہ ناظم الدین صاحب۔ لیاقت علی خاں کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چوہدری صاحب نے فرمایا کہ وہ جلدی فیصلہ

کرنے کے عادی نہیں تھے۔ بہت زیادہ سوچتے تھے۔ اتنا سوچتے تھے کہ بعض اوقات ان کی سوچ تکلیف دِہ ہو جاتی تھی۔ غلام محمد صاحب کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایک خالص موقعہ پرست انسان تھے۔ انہیں نہ پاکستان سے اور نہ ہی پاکستان کے نظریہ سے کوئی لگاؤ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عوام الّو کے پٹھے ہیں۔ ان کو ڈنڈے سے ٹھیک کیا جائے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ہماری مصیبتوں کا آغاز اس دن ہُوا جس دن لیاقت علی خاں کو قتل کیا گیا۔

جناب ایم۔ایچ اصفہانی، کراچی

ایم۔ایچ اصفہانی قائد اعظم محمد علی جناح کے قریبی رفقاء کار میں سے تھے۔ ان کا تعلق بنگال سے تھا، پاکستان کی تحریک میں انہوں نے بڑے کام سرانجام دیئے ہیں، وہ پاکستان کے امریکہ میں پہلے سفیر تھے۔ میری ان سے یہ ملاقات ۲۸ دسمبر ۱۹۷۴ء کو کراچی میں ان کے دفتر میں ہوئی۔ اس کی روداد نذرِ قارئین کر رہا ہوں۔

پاکستان تحریک کے نشیب و فراز پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب اصفہانی صاحب نے فرمایا۔ کہ دو ریاستوں کے تصور کو ۱۹۴۶ء کے دہلی میں منعقدہ لیجسلیٹو کنونشن کی قرارداد نے دفن کر دیا تھا۔ بعد میں "بڑے بنگال" کی تحریک شروع ہوئی۔ میرے خیال میں سہروردی صاحب کا یہ خیال تھا کہ اگر بنگال تقسیم ہو گیا تو مشرقی بنگال میں خواجہ ناظم الدین صاحب کے حواریوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ سہروردی صاحب خود چیف منسٹر تھے وہ اس بات کو سمجھ رہے تھے کہ تقسیم سے اسمبلی میں ان کی حیثیت متاثر ہو گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ سہروردی صاحب سرت چندر بوس کے زیر اثر تھے، ہو سکتا ہے کہ گاندھی جی کے ایماء پر سرت چندر بوس نے یہ تحریک چلائی ہو، چونکہ کانگریس کے فارورڈ بلاک کی رہنمائی سرت چندر بوس کر رہے تھے۔ جناح صاحب نے پہلے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کیا کیونکہ انہیں اس

چکر کا علم نہیں تھا لیکن جب انہیں علم ہُوا تو انہوں نے سہروردی صاحب کو منع کیا میں اس بات کو ماننے کے لیئے تیار نہیں ہوں کہ قائد اعظم نے سہروردی صاحب کو تحریک کو آگے بڑھانے کی اجازت دے دی تھی۔ میں محمد علی جناح کو بخوبی جانتا ہوں وہ ایک شریف انسان تھے۔ اور اپنے الفاظ پر ہمیشہ قائم رہتے تھے۔

جہاں تک قرارداد لاہور میں "ریاستوں" کے لفظ کا تعلق ہے اس پر اصفہانی صاحب نے فرمایا۔ کہ جناح صاحب کی نگاہ میں یہ محض کتابت کی غلطی تھی اور اس کو ۱۹۴۶ء میں درست کر لیا گیا تھا۔

جہاں تک "بڑے بنگال کی تحریک" کا تعلق ہے وہ جناح صاحب کی نگاہ میں سہروردی صاحب کی سب سے بڑی غلطی[1] تھی۔ چونکہ جناح صاحب کو یہ محسوس ہو گیا کہ وہ ایک جال تھا جس میں سہروردی صاحب کو پھنسایا جا رہا ہے۔ میں اس وقت بنگال میں تھا اور مجھے بنگال کے ایک ایک ذرہ کا علم ہے۔ میں بنگالیوں کو بخوبی سمجھتا ہوں، بنگالی لوگ بکاؤ مال ہیں۔ میں نے ان کو خریدا ہے۔ کچھ کی قیمت دو ہزار روپیہ ہے، کچھ کی قیمت دس ہزار روپیہ تھی۔ کچھ کو نوکریوں کی ضرورت تھی۔

اصفہانی صاحب نے سہروردی صاحب اور لیاقت علی خاں کی شخصیتوں کا موازنہ کرتے ہوئے فرمایا۔ لیاقت علی خاں مسلم لیگ کے اعلیٰ ترین حلقہ سے تعلق رکھتے تھے اور وہ اپنے آپ کو سہروردی سے کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ سہروردی صاحب تو سنٹرل ورکنگ کمیٹی کے بھی رکن نہیں تھے جبکہ لیاقت علی خاں آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔

---

[1] میرے پاس مستند تاریخی شواہد ہیں جو اصفہانی صاحب کے اس موقف کو غلط ثابت کرتے ہیں درحقیقت قائد اعظم نے سہروردی صاحب کو اس تحریک کو آگے بڑھانے کی اجازت دے دی تھی گو قائد اعظم اس مسئلہ پر امید افزا نہیں تھے۔

قائداعظم کے دائیں ہاتھ تھے لیکن جہاں تک قابلیت اور صلاحیت کا تعلق ہے سہروردی صاحب میرے عہد کی سب سے زیادہ غیر معمولی شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ ان میں قوتِ فیصلہ بے پناہ تھی۔ وہ فیصلہ کر کے فیصلہ پر قائم رہنے والے انسان تھے۔ خواجہ ناظم الدین سے ان کے تعلقات کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے اصفہانی صاحب نے فرمایا "سہروردی صاحب نے خود اپنے آقا ناظم الدین کے خلاف سازش کی تھی، خواجہ صاحب جب کہ وزیر اعظم متحدہ بنگال تھے وہ سہروردی کے مشورہ کے بغیر کچھ نہیں کرتے تھے لیکن سہروردی صاحب نے خواجہ صاحب کی پیٹھ میں چھرا گھونپا جس پر مایوس ہو کر خواجہ ناظم الدین صاحب نے استعفا دے دیا تھا، یہ بات تقسیم ہند سے قبل کی ہے لیکن تقسیم کے وقت خواجہ صاحب نے انتقام لے لیا "تقسیم ہند کے وقت سہروردی صاحب کے زیرِ اثر جو مغربی بنگال کے اراکینِ اسمبلی تھے۔ وہ ہندوستان میں رہ گئے۔ اس طرح مشرقی بنگال میں جو اراکینِ اسمبلی رہ گئے وہ خواجہ ناظم الدین کے زیرِ اثر تھے۔ یہ صرف بنگالی سیاست کا تماشہ تھا۔ اس میں لیاقت علی خاں کو کوئی دخل نہ تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ دونوں[1] حضرات ایک دوسرے سے جلتے تھے۔ لیاقت علی خاں بعض اوقات بڑے ضدی ہو جاتے تھے۔ سہروردی صاحب میں بھی ایسی ہی خصلت تھی۔

جب میں امریکہ میں بہ حیثیت سفیر پاکستان ہو کر گیا۔ تو میں نے قائداعظم سے پوچھا "مجھے کیا کرنا ہے اور کیا ہماری پالیسی ہوگی؟ اس پر قائداعظم نے فرمایا "کسی بھی انسان سے غلطی ہونے کا احتمال موجود ہے، مجھے یقین ہے کہ اگر آپ سے کوئی غلطی ہوگی تو دانستہ نہیں ہوگی۔ قائداعظم سے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے اصفہانی صاحب نے فرمایا کہ قائداعظم راجہ محمود آباد سے اور مجھ سے بڑی شفقت سے

---

[1] لیاقت علی خاں اور سہروردی صاحب۔

پلیش آتے تھے۔ اپنے بچوں کی طرح ہم سے سلوک فرماتے تھے۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ میرے لیے ایک خصوصی جہاز کا انتظام کیا جائے۔ جو مجھے کوئٹہ قائداعظم کے پاس لے جائے۔ قائداعظم کے پھیپھڑے چھلنی ہو چکے تھے۔ انہیں اس وقت موت سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا، مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اگر آپ قائداعظم کو برف کی سلوں میں بھی رکھ کر لاتے۔ تب بھی وہ زندہ نہیں بچ سکتے تھے۔

جس وقت میں ان سے ملا وہ بہت افسردہ تھے، انہوں نے فرمایا کہ کاش میں تندرست ہوتا۔ میں فلاں فلاں کام کرتا۔ فلاں تبدیلیاں لاتا۔ میرے اصرار پر کہ وہ کیا کیا تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے اس پر اصفہانی صاحب نے فرمایا۔ ان چیزوں کو میں نہیں بتا سکتا ہوں۔ تاریخ کو ابھی ان باتوں کا انتظار کرنا ہے، اگر میں انتظار کر سکتا ہوں تو پھر تاریخ بھی انتظار کر سکتی ہے۔ بلاشبہ قائداعظم کئی اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کے متمنی تھے، انہوں نے مجھے فون پر کوئٹہ آنے کی دعوت دی تھی، میں نے کہا کہ جمعہ سے پہلے میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ اس زمانہ میں فلائٹ ہفتہ میں صرف دو مرتبہ پرواز کرتی تھی اس پر قائداعظم نے فرمایا کہ خصوصی جہاز کا انتظام کر کے یہاں آجاؤ، سکندر مرزا صاحب نے جو کہ ڈیفنس سیکرٹری تھے۔ میرے جہاز کا بندوبست کیا۔ میرے اس سوال پر کہ جناب عالی آپ کے لیے تو خصوصی طیارے کا انتظام ہو گیا مگر خود قائداعظم کے معالج کے لیے کوئی ایسا انتظام نہ ہو سکا تو اس پر اصفہانی صاحب جذباتی ہو گئے اور خاموشی اختیار کر لی۔

اصفہانی صاحب نے مولوی فضل الحق کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ مولوی صاحب کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی، نہ وہ ضدی تھے اور نہ ہٹ دھرم۔ وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے تھے، ان کے لیے الفاظ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن وہ بلاشبہ ایسی شخصیت کے مالک تھے۔ جن سے ایک عام آدمی کو محبت تھی۔

قائد اعظم کے بارے میں حکومتوں کے رویّوں کا ذکر کرتے ہوئے اصفہانی صاحب نے فرمایا کہ تاریخ سے ان کا نام کوئی نہیں مٹا سکتا۔ مجھے علم ہے کہ اس سلسلہ میں بڑی کوششیں ہوئی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ سلسلہ لیاقت علی خاں کے زمانہ میں تھا۔ ناظم الدین کے زمانہ میں بھی رہا۔ غلام محمد کے زمانہ میں بھی ہو رہا تھا۔ اسکندر مرزا کے زمانہ میں بھی ہو رہا تھا، ایوب کے زمانہ میں بھی۔ یحییٰ خاں کے زمانہ میں بھی، کوئی قائد عوام بن گیا، کوئی قائد ملت، کوئی قائدِ سلطنت لیکن کچھ بھی نہ بن سکے جس مرتبہ پر قائد اعظم محمد علی جناح پہنچ چکے تھے کوئی ان کے خاکِ پا تک بھی نہیں پہنچ سکے گا۔

محمد ایوب کھوڑو

جناب محمد ایوب کھوڑو کا تعلق سندھ کے ایک بڑے زمیندار گھرانہ سے تھا۔ ان کے والد عاقل گوٹھ، لاڑکانہ کے بڑے زمیندار تھے۔ وہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ قبل از پاکستان ان کی سیاسی خدمات آل انڈیا مسلم لیگ کے لیے وقف تھیں۔ سندھ کی سیاست کو سمجھنے کے لیے جناب محمد ایوب کھوڑو کی زندگی کا مطالعہ بڑا ضروری ہے۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے قریبی رفقاءِ کار میں سے تھے، پاکستان کے قیام کے بعد وہ تین مرتبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے اور وزیر اعظم فیروز خاں نون کی کابینہ میں مرکزی وزیر دفاع تھے۔ ۶ مارچ ۱۹۸۱ء کو انتقال ہوا۔ مجھے ان سے تین مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ جس کی مختصر اً روداد نذرِ قارئین کرتا ہوں میری آخری ملاقات ۹ مئی ۱۹۷۸ء کو کراچی میں ہوئی تھی۔

جناب کھوڑو صاحب نے آل انڈیا مسلم لیگ کے آخری دو اجلاس[1] کی کارروائی کا حال بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس موقعہ پر جناح صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اب جبکہ پاکستان قائم ہو چکا ہے تو آل انڈیا مسلم لیگ کو برقرار رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے ۔ پاکستان ایک جدا ملک ہے۔ اور انڈیا ایک الگ ملک ہے۔ لہذا آل انڈیا مسلم لیگ کے اثاثوں کو تقسیم کرنا پڑے گا۔ پاکستان کو اس کا اپنا حصہ ملنا چاہیئے اور ہندوستان کو اس کا اپنا حصہ۔

جناب کھوڑو صاحب نے فروری ۱۹۴۸ء میں فریئر ہال کراچی میں منعقد ہونے والے تاریخی اجلاس کی روئداد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ اس اجلاس میں جناح صاحب نے مسلم لیگ کی صدارت سے استعفاء دے دیا تھا، چونکہ بحیثیت گورنر جنرل ہونے کے وہ اب مسلم لیگ کے صدر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس اجلاس میں جناح صاحب کا یہ خیال تھا کہ لیاقت علی خاں کو پاکستان مسلم لیگ کا صدر بنا دیا جائے لیکن اراکینِ کونسل اس مسئلہ پر اختلاف رائے رکھتے تھے۔ مسلم لیگ کے ایک گروپ کا یہ خیال تھا کہ حکومت اور لیگ اکٹھی ہی رہنی چاہئیں۔ اس مسئلہ پر ہاؤس کی رائے طلب کی گئی۔ جناح صاحب کی تجویز شکست کھا گئی۔ اس موقعہ پر پنجابی حضرات اور مہاجرین اکٹھے ہو گئے تھے۔ جلسہ میں کسی ایک شخص نے کھڑے ہو کر یہ کہہ دیا کہ مس جناح کو صدر بنا دیا جائے۔ اس کے بعد جناح صاحب ناراض ہو کر اجلاس سے تشریف لے گئے۔

جناب کھوڑو صاحب نے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر

---

[1] آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ آخری اجلاس تھا۔ یہ کراچی شہر میں خالق دینا ہال میں ۱۴ دسمبر اور ۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوا تھا۔

کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ جناح صاحب کی وہ تقریر بہت اچھی تھی، ان کی یہ خواہش نہیں تھی کہ اقلیتیں پاکستان کو چھوڑ کر چلی جائیں۔ ہندوستان میں ہمارے چار کروڑ مسلمان رہ گئے تھے۔ وہ اس ریاست کو مذہبی ریاست کا رنگ دینا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی یہ کوئی مذہبی ریاست تھی اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جناح صاحب اسلامی ریاست کا قیام چاہتے تھے وہ الو کے پٹھے ہیں۔ جو لوگ جناح صاحب کو ولی اللہ بنا لیتے ہیں وہ غلط ہیں۔ وہ کوئی ولی اللہ نہیں تھے۔ وہ ایک سیاست دان تھے اور مدبر تھے۔ وہ بدلے ہوئے حالات میں مسلم لیگ کا کردار بھی بدلنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جناح صاحب نے مجھ سے خود اس رائے کا اظہار خیال فرمایا کہ مسلم لیگ پارٹی ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی نہ کہ ایک مقصد تھا۔ مسلم لیگ کا مقصد حصولِ پاکستان تھا اور اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے تو مسلم لیگ کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ اس کو بحیثیت ایک سیاسی پارٹی کے ملک کے لیے کام کرنا چاہیئے۔ نہ کہ ایک مذہبی جماعت کی حیثیت سے۔ اور یہی وجہ تھی کہ بعد میں ہم لوگوں نے غیر مسلمانوں کو اس پارٹی میں شمولیت کی اجازت دے دی تھی۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کے بعد جناح صاحب کا یہ نظریہ تھا کہ مسلم لیگ کو اب بحیثیت ایک سیاسی جماعت کے کام کرنا چاہیئے۔ اب یہ صرف مسلمانوں ہی کے مفاد کا تحفظ نہ کرے بلکہ تمام لوگوں کے مفاد کا جو ملک میں رہتے ہیں۔

قائداعظم اور لیاقت علی خاں کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے کھوڑو صاحب نے فرمایا کہ پاکستان بننے کے بعد جناح صاحب اور لیاقت علی کے درمیان تعلقات میں تبدیلی کا باعث مس فاطمہ جناح اور بیگم لیاقت علی کی آپس میں چپقلش بھی تھی۔ مس جناح قائداعظم کی بہن تھیں۔ قائداعظم چاہتے تھے کہ ان کا احترام ملک کی خاتونِ اول کی طرح ہونا چاہیئے۔ بیگم رعنا لیاقت علی خاں اس بات پر معترض تھیں۔ ان کا یہ موقف تھا کہ مس فاطمہ جناح قائداعظم کی بہن ہیں۔ اگر وہ اہلیہ ہوتیں تو پھر ان کا خاتونِ اوّل

ہونے کا حق بنتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ قائداعظم کی بہن ہیں اس لیے وہ ملک کی خاتونِ اول نہیں بن سکتیں۔ میں وزیراعظم کی بیوی ہوں اس لیے میں خاتونِ اول ہوں۔ بہرحال یہ تنازعہ وقت کے ساتھ ساتھ سنجیدگی اختیار کرتا چلا گیا۔ ایک تصویر میں جناح صاحب کسی دعوت میں تشریف لے جا رہے ہیں اور ان کے ہمراہ لیاقت علی خاں اور بیگم لیاقت علی خاں بھی ہیں۔ اس تصویر میں بیگم لیاقت علی پیش پیش ہیں۔ وہ جناح صاحب سے بھی آگے چل رہی ہیں۔ یہ تصویر ان کی نفسیات کی عکاسی کرتی ہے۔ میرے خیال سے مارچ ۱۹۴۸ء میں جناح صاحب کے تعلقات لیاقت علی خاں سے بگڑنے شروع ہو گئے تھے۔ مجھے جناح صاحب نے ایک دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ اس موقعہ پر صرف مسٹر جناح اور ان کی ہمشیرہ، میں اور میری اہلیہ موجود تھے۔ گفتگو کے دوران جناح صاحب نے فرمایا کہ میرا وزیراعظم اس عہدے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وہ ایک اوسط درجہ کے انسان ہیں لیکن جناح صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ لیاقت علی خاں کی جگہ کس شخص کو لانا چاہتے تھے۔ یہ بات میرے علم میں ہے کہ وہ لیاقت علی خاں اور بیگم لیاقت علی کے خلاف ہو چکے تھے۔ وہ خود بیمار پڑ گئے۔ ورنہ وہ لیاقت علی خاں کو وزارتِ عظمیٰ سے ہٹا کر مشرقی پاکستان میں بحیثیت ایک گورنر کے بھیجنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ بقول کھوڑو صاحب، جناح صاحب فروری ۱۹۴۸ء تک لیاقت علی خاں کے خلاف نہیں تھے۔ کیونکہ فروری ۱۹۴۸ء میں انہوں نے لیاقت علی خاں کا نام صدارتِ مسلم لیگ کے لیے تجویز کیا تھا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں لیاقت علی خاں کے بارے میں ان کی رائے میں تبدیلی رونما ہوئی، مجھے یاد ہے کہ ۱۰ اپریل ۱۹۴۸ء کو جناح صاحب نے کہا کہ لیاقت، وزیراعظم ہونے کے قابل نہیں ہے۔ پھر مجھے خفیہ طور سے معلوم ہوا کہ وہ لیاقت علی خاں کو مشرقی پاکستان بحیثیت گورنر کے بھیج رہے ہیں چونکہ انگریز گورنر جا رہا تھا۔ اس زمانہ میں غلام محمد جناح صاحب کے بہت قریب آ چکے تھے۔ انہوں نے

اسٹیٹ بنک کی افتتاح بھی جناح صاحب سے کروایا تھی۔ اس زمانہ میں غلام محمد اور لیاقت علی خاں میں رقابت چل رہی تھی۔

جہاں تک غلام محمد صاحب کا تعلق ہے وہ قبل از پاکستان حیدر آباد میں تھے۔ جناح صاحب نے ان کو وہاں سے بلایا تھا۔ میری غلام محمد صاحب سے پہلی ملاقات دہلی میں لیاقت علی خاں صاحب کے مکان پر ہوئی تھی۔ اس دن لیاقت علی خاں نے مجھے کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ جب میں لیاقت علی کے گھر پہنچا تو وہاں غلام محمد صاحب کو باہر بیٹھے ہوئے انتظار کرتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت میں ان سے واقف نہیں تھا۔ انہوں نے خود ہی اپنا تعارف کروایا۔ اس کے بعد لیاقت علی خاں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ لیاقت علی خاں نے ان سے کہا کہ ہم آپ کو وزیر خزانہ بنانا چاہتے ہیں آپ پاکستان تشریف لے آئیں۔ اس واقعہ کے بعد جلد ہی میری ملاقات جناح صاحب سے ہو گئی۔ میں نے جناح صاحب سے کہا کہ آپ کس طرح غلام محمد اور چوہدری ظفر اللہ کو کابینہ میں لے رہے ہیں۔ یہ لوگ تو آپ کو اور مسلم لیگ کو دن رات گالیاں دیتے نہیں تھکتے تھے۔ اس پر جناح صاحب نے فرمایا۔ کہ میرے پاس قابل افراد نہیں ہیں۔ انہوں نے بھوپال[1] کے نواب صاحب کو پنجاب کی گورنری کی پیش کش کی تھی لیکن نواب صاحب بڑے ہوشیار انسان تھے۔ وہ اس وقت ہندوستان کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔

جناب جی ایم سید کے بارے میں کھوڑو صاحب نے فرمایا۔ کہ انہوں نے جناح صاحب کو ۱۹۴۵ء میں چھوڑ دیا تھا۔ سید صاحب اپنی پسند کے تمام آدمیوں کو ہونے والے انتخابات میں ٹکٹ دلوانا چاہتے تھے لیکن جناح صاحب نے کہا کہ یہ مناسب نہیں ہے۔ جناح صاحب نے ہاشم گزدر کو نکال دیا تھا۔ دراصل جھگڑا ٹکٹوں کی بنا

---

[1] حمید اللہ خاں صاحب بھوپال کے نواب تھے۔

پر ہوا تھا۔ جس پر سید صاحب نے اپنی متوازی لیگ بنائی۔ سندھ اسمبلی کو توڑنا پڑا پھر نئے انتخابات دسمبر میں ہوئے، ان انتخابات میں سید صاحب شکست کھا گئے۔

قائداعظم اور خان عبدالغفار خاں صاحب کے تعلقات کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے کھوڑو صاحب نے فرمایا کہ خان عبدالغفار خاں صاحب کو جناح صاحب نے ڈنر پر بلایا تھا۔ میں بھی اس کھانے میں مدعو تھا۔ ان حضرات کی آپس میں باتیں ہوئیں غفار خاں نے کہا کہ جناح صاحب کا رویہ ٹھیک ہے تاہم جب جناح صاحب پشاور تشریف لے گئے تو قیوم خاں نے سازش کی، اس میں لیاقت علی بھی شریک تھے۔ اس طرح یہ قربتیں آگے نہ بڑھ سکیں۔

لیاقت علی خاں کے قتل کے بارے میں کھوڑو صاحب نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کیا سازش تھی، یہ ایک راز ہے، کوئی کہتا ہے کہ اس میں پنجاب کے کچھ لوگ شریک تھے جو لیاقت علی خاں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ تمام قیاس آرائی ہی ہے۔ تمام گپیں ہیں۔ گپوں پر بیان نہیں دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ غلام محمد ذمہ دار تھا یا مشتاق احمد گورمانی یا قربان علی آئی جی پولیس۔ تو یہ مضحکہ خیز بات ہوگی۔

جناب اربابِ عبدالغفور صاحب

جناب اربابِ عبدالغفور صاحب تحریکِ آزادی کے ایک نامور سپاہی تھے۔ انہوں نے تحریکِ خلافت میں بھی شرکت کی۔ پھر خدائی خدمت گاروں کی تحریک میں شامل ہوئے۔ جیل کی مصیبتیں کاٹیں۔ بعد میں ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ اختلافات ہونے کے باعث سرخپوش تحریک سے جدائی اختیار کر لی اور مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ ہو گئے، لیکن مسلم لیگ بھی ان کی سیاسی آرزوؤں کو پورا نہ کر سکی۔ پھر وہ پیر صاحب مانکی شریف کے ایماء پر عوامی لیگ میں شامل ہو گئے۔ ان کی بے باک طبیعت نے اور صاف گوئی کی عادت نے ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ جس وقت میری ان سے ملاقات ہوئی وہ اس وقت خانہ نشین تھے اور ضعیفی نے ان کے حوصلوں کو کمزور کر دیا تھا۔ ان سے ملاقات کی تفصیل پیش کرتا ہوں۔ یہ ملاقات ارباب صاحب کے دولت خانہ پر ۸ اپریل ۱۹۷۶ء کو ہوئی تھی۔

خدائی خدمت گاروں کی تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب ارباب عبدالغفور صاحب نے فرمایا کہ اس تحریک کی ابتداء دراصل ہجرتِ افغانستان سے شروع ہوئی

تھی لیکن تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ایک طبقہ کا یہ خیال تھا کہ صوبہ سرحد کا علاقہ افغانوں کا علاقہ ہے اور چونکہ ہم لوگ افغان ہیں اس لیے افغان قوم کی خدمت کرنی چاہیئے، اس تصور کے تحت انجمن اصلاح افغانیہ کا قیام ظہور پذیر ہوا۔ شروع میں ہم نے لوگوں کی تعلیمی پس ماندگی کی طرف توجہ دی اور ساتھ ہی ساتھ ان کے دلوں میں وطن کی آزادی کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے ڈراموں اور مشاعروں کا سہارا لیا۔ ۱۹۲۹ء کا زمانہ اس تحریک کا اہم زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں ہم خیال دوستوں کے مشورہ سے ایک پارٹی وجود میں آئی جس کا نام "افغان جرگہ" رکھا گیا۔ ان کی وردی سرخ رنگ کی تھی۔ حکومتِ برطانیہ ہماری اس بیداری سے خائف ہوگئی، وردی کے رنگ کی وجہ سے حکومتِ برطانیہ کو یہ شبہ ہوا کہ اس تحریک کا تعلق روس سے ہے۔ حالانکہ روس سے ہمارا کوئی تعلق نہ تھا۔ لہٰذا حکومت ہماری مخالف ہوگئی اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوگیا خان عبدالغفار خاں اس تحریک میں بڑے نمایاں تھے۔ بڑی تعداد میں خدائی خدمت گار پکڑے گئے اور حکومت نے بڑا تشدد کیا۔ اس وقت صوبہ سرحد کو "سرزمینِ بے آئین" کہا جاتا تھا۔ صاحب زادہ عبدالقیوم خاں گورنمنٹ کے آدمی تھے، ان سے پارٹی کے سرکردہ لوگوں نے اس مسئلہ پر بات چیت کی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ لوگوں کو مصیبت سے باہر نکالنے کے لیے انڈین نیشنل کانگرس کا ہاتھ پکڑنا پڑیگا ورنہ انگریز اس تحریک کو برباد کردیں گے۔ پارٹی کے تمام بڑے بڑے لوگ جیلوں میں تھے۔ دوسری طرف سر فضل حسین تھے جنہوں نے مشورہ دیا کہ مسلم کانفرنس والوں سے رابطہ قائم کیا جائے مگر صاحب زادہ عبدالقیوم خاں کی یہ رائے تھی کہ کانگرس ایک منظم جماعت ہے اور وہی اس مصیبت کے وقت خدائی خدمت گاروں کو انگریزوں کے پنجے سے چھڑا سکتی ہے۔ علماءِ ہند بھی اس وقت کانگرس سے وابستہ ہوچکے تھے۔ اس طرح خدائی خدمت گاروں کا رابطہ کانگرس پارٹی سے ہوگیا۔

صوبہ سرحد میں اس وقت مارشل لاء سے بدتر حالت تھی۔ خان عبدالغفار خاں میاں احمد شاہ بیرسٹر اور عبدالاکبر خاں وغیرہ جیلوں میں تھے ان حضرات سے جیلوں میں مشورہ کیا گیا۔ ان حضرات کی رائے حاصل کرنے کے بعد کانگرس پارٹی سے معاہدہ ہوگیا۔ بعد میں گاندھی ارون معاہدہ ہوگیا جس کے نتیجہ میں تمام خدائی خدمت گار قید سے رہا ہو گئے۔ رہائی حاصل کرنے کے بعد خان عبدالغفار خاں، میاں احمد شاہ، پیر بخش اور دیگر حضرات بمبئی تشریف لے گئے، جہاں کانگرس کا اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں خدائی خدمت گاروں پر اعتراضات کیے گئے کہ یہ ایک مذہبی جماعت ہے۔ اس کا نعرہ اللہ اکبر ہے۔ یہ امام بری کہتے ہیں۔ ان کے جھنڈے پر حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہم کے نام ہیں۔ اس طرح مخالفت شروع ہوگئی۔ مگر گاندھی جی نے بڑی ہوشیاری سے صورتِ حال کو قابو میں کر لیا۔ وہ اس بات کو سمجھ رہے تھے کہ اگر صوبہ سرحد میں یہ پارٹی نہ ہو اور غفار خاں نہ ہو تو یہاں کام نہیں بنتا۔ انہوں نے ایک درمیانی راستہ نکال لیا کہ یہ لوگ بلاشبہ اپنے آپ کو خدائی خدمت گار کہلوائیں البتہ جھنڈا انیشنل کانگریس کا ہوگا اس طرح کانگریس کے جھنڈے تلے یہ جماعت آگئی۔ مگر اس فیصلہ سے افغان جرگہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ بیرسٹر میاں احمد شاہ صاحب اس پارٹی سے جدا ہو گئے ہیں اس وقت جیل میں تھا۔ مجھے یہ باتیں خان عبدالغفار خاں نے بتائیں تھیں۔ کانگریس کے ساتھ الحاق ہونے کے بعد خدائی خدمت گاروں کی تحریک میں شگاف پڑ گئے۔

جناب ارباب عبدالغفور خاں نے اپنی سیاسی جدوجہد کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ جس وقت انگریزوں کے خلاف QUIT INDIA "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع ہوئی تو انہوں نے مہابت خاں کی مسجد میں انگریزوں کے خلاف ایک تقریر کی تھی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ جنگ یورپ کی جنگ ہے لیکن اس جنگ میں ہمارے آدمیوں کو قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک کی دولت کو لٹایا جا رہا

ہے۔اس جنگ میں جو مسلمان شریک ہو گا وہ اسلام کے دائرے سے باہر ہو جائیگا وہ کتے کی موت مرے گا۔ اس تقریر کے نتیجہ میں ارباب صاحب کو دو سال کی قید ہو گئی تھی۔

بقول ارباب صاحب پاکستان کے قیام کے وقت سردار عبدالرب نشتر کے توسط سے ان کا رابطہ قائد اعظم کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اس طرح ان کا مسلم لیگ سے تعلق قائم ہُوا۔ وہ نواب اسمٰعیل خاں کے بڑے معترف تھے۔ لیکن چودھری خلیق الزمان کو سخت قسم کا مکّار انسان تصور کرتے تھے۔ بقول ارباب صاحب کے چودھری خلیق الزمان ہی نے مسلم لیگ کا بیڑہ غرق کیا۔ جس وقت مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی وہ جیل میں چلے گئے اور آزادی کا اعلان[1] انہوں نے جیل میں سُنا۔

قائد اعظم اور عبدالغفار خاں صاحب کے مابین صلح صفائی کا حال بیان کرتے ہوئے ارباب صاحب نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں بڑی کوششیں ہوئیں مگر تمام کوششوں کو ناکام کرنے میں خان عبدالقیوم خاں پیش پیش تھے۔ پاکستان بننے سے قبل دو تین کوششیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ پیر صاحب مانکی شریف نے دہلی میں باچہ خاں کی ملاقات قائد اعظم سے کرائی مگر یہی قیوم خاں تھے جنہوں نے روڑے اٹکائے۔ پھر جب پاکستان بن گیا تو کراچی میں آئین ساز اسمبلی کے اجلاس کے موقعہ پر غفار خاں صاحب کی گفتگو لیاقت علی خاں صاحب اور قائد اعظم سے جدا جدا ہوئی۔ خان عبدالغفار خاں صاحب نے قائد اعظم سے کہا۔ پہلے وہ ملک کی آزادی کے لیے کام کر رہے تھے، اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے تو اب وہ اس کی خدمت کریں گے۔ یہ ان کا اپنا ملک ہے۔ اس موقعہ پر غفار خاں صاحب نے قائد اعظم کو پشاور آنے کی دعوت بھی دی جس پر قائد اعظم نے فرمایا کہ "جب میں فرنٹیر آؤں گا تو ضرور آپ کا مہمان ہوں گا"۔ اس بات چیت کا علم جب قیوم خاں کو ہُوا تو

---

[1] تین جون ۱۹۴۷ء

انہوں نے سازشیں شروع کر دیں جس میں ان کے شریک کار اسکندر مرزا اور ایس بی شاہ تھے قیوم خاں نے کہا۔ کہ یہ خطرناک لوگ ہیں آپ کو قتل کر دیں گے اور ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا مگر یہ بالکل جھوٹ تھا۔ مجھ سے خود عبدالغفار خاں نے کہا کہ دریا کے کنارے پر ان کی ضیافت کی جائے گی اور ان کا قرار واقعی احترام ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ ان کے شایانِ شان دعوت دی جائے گی۔ مگر غفار خاں صاحب کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

پشاور میں قیام کے دوران قائداعظم نے کونسل کی ایک میٹنگ گورنمنٹ ہاؤس میں بلائی تھی جس میں میں خود بھی شریک تھا۔ ہم سب نے کہا کہ آپ کو غلط اطلاع فراہم کی گئی ہے۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ پٹھان اس بات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ آپ نے اتنا بڑا ملک بنایا۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ ہاں لوگ تو گاندھی کی بھی قدر کرتے تھے مگر انہی لوگوں میں سے کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے گاندھی جی کو قتل کر دیا۔ یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے اگر کوئی قتل کر دے تو ناممکن نہ ہو گا۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر خان صاحب اور باچہ خاں صاحب دونوں گورنمنٹ ہاؤس قائداعظم کے پاس تشریف لے گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ جو بات ہم نے آپ سے کی تھی اُس پر ہم قائم ہیں۔ ہم اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے آپ کے سامنے کہہ دیں گے کہ ہم حتی المقدور پاکستان کی خدمت کریں گے۔ مگر جناح صاحب کے دل میں یہ بات جاگزین کرا دی گئی تھی کہ اگر وہ غفار خاں کے یہاں چلے گئے تو وہاں پر سرخ پوشوں کی ریلی ہو گی اور وہ زندہ نہیں بچ سکیں گے۔

فروری ۱۹۴۸ء کی پاکستان مسلم لیگ کے جلسہ کی کارروائی کا حال بیان کرتے ہوئے ارباب صاحب نے فرمایا کہ اس میٹنگ میں پاکستان مسلم لیگ دو واضح گروپوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ مسئلہ یہ زیر بحث تھا کہ آیا مسلم لیگ کا عہدہ اور حکومت کا عہدہ جدا جدا رہیں یا دونوں عہدوں کو اکٹھا رکھا جائے۔ جدا رکھنے کے حق میں جو حضرات تھے اس میں نمایاں شخصیتیں پیر صاحب مانکی شریف اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی تھیں اور ارباب عبدالغفور صاحب خود بھی

اسی گروہ سے وابستہ تھے۔ تین دنوں تک اس مسئلہ پر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ قائداعظم اس رائے کے حق میں تھے کہ یہ عہدے اکٹھے رہیں۔ دو دنوں تک قائداعظم نے اس مسئلہ پر تقریریں کیں۔ ان کی بڑی زوردار تقریر تھی۔ انہوں نے تیسرے دن بھی اردو میں تقریر کی۔ شاید خیال کر کے کہ یہ لوگ مسئلہ کی نزاکت کو انگریزی زبان میں نہیں سمجھ رہے ہیں۔ ان کی اردو ٹوٹی پھوٹی تھی۔ مگر پھر بھی اکثریت ہاؤس میں مخالفین کی تھی۔ لہذا بالآخر اس مسئلہ پہ لوگوں کی رائے طلب کی گئی۔ ہم لوگ دس ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے! اس کے بعد قائداعظم ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوتے۔ میز پر جو کاغذات تھے ان کو اکٹھا کیا اور غصہ میں چلے گئے۔ اس کے بعد لیاقت علی خاں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی تک جو جماعت تھی وہ ٹوٹ گئی ہے۔ اس کا کوئی صدر نہیں رہا ہے۔ اس کا جنرل سیکرٹری نہیں ہے۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ اس میٹنگ کے لیے عبدالرب نشتر صدر ہو جائیں۔ لہذا وہ صدر ہو گئے۔ نشتر صاحب نے فرمایا کہ میں وہ کچھ کروں گا جو آپ کی مرضی ہو گی۔ یہ کام کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے یا ایک شخص واحد کو اختیار دے دیا جائے۔ اس موقعہ پر کسی نے آواز دی کہ ایک آدمی کے ہاتھ میں دے دو۔ ان کا خیال تھا کہ پیر مانکی شریف یا مولانا شبیر احمد عثمانی میں سے کوئی ایک صدر ہو جائے گا۔ مگر انہوں نے فرمایا کہ ہم لیڈر بننے کے لیے نہیں آئے۔ بالآخر چودھری خلیق الزمان کا نام پیش ہوا اور ان کے مقابلے میں فیروز خان نون کھڑے ہو گئے۔ خلیق الزمان کو اکثریت نے ووٹ دیے اور اس طرح وہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔

ارباب عبدالغفور صاحب نے فرمایا کہ اس کے بعد وہ خود مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے۔ اور پیر صاحب مانکی شریف کی قیادت میں عوامی لیگ میں شامل ہو گئے۔ ارباب صاحب نے ڈاکٹر خان صاحب کی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ان میں خدمت خلق کا بڑا مادہ تھا۔ میں آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ ان سے بات چیت

کر سکتا تھا مگر وہ عمر میں میرے والد کے برابر تھے۔ بعض اوقات میرے ان سے بھی اختلافات ہوئے مگر کبھی انہوں نے دل پر میل نہیں آنے دیا۔ خان عبدالغفار خاں ان سے مختلف طبیعت کے انسان ہیں وہ عام پٹھانوں کی طرح سیدھے سادے انسان ہیں۔ ارباب صاحب خدائی خدمت گاروں کے جنرل سیکرٹری بھی تھے۔ ایک زمانہ میں خدائی خدمت گاروں کی تعداد ایک لاکھ افراد تک پہنچ گئی تھی۔ ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو تشریف لائے۔ انہوں نے ڈاکٹر خان صاحب سے پوچھا۔ کہ یہ کالے کالے بکس کیا ہیں؟ ڈاکٹر خان صاحب نے فرمایا۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے ہیں؟ ان میں خفیہ کاغذات ہوتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے فرمایا کہ آپ نہ ان کو پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ یہ صندوقچے اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دیں۔ اور لوگوں سے رابطہ قائم کریں۔ دوسرے لوگوں کے سپرد یہ کام کر دیں۔ جن لوگوں نے پارٹی کے لیے قربانیاں دی ہیں ان لوگوں کی خدمات کو سراہیں۔

ارباب صاحب نے مسلم لیگ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلم لیگ میں کچھ لوگ ضرور مخلص تھے۔ مگر زیادہ تر ابن الوقت۔ خان بہادر، نواب اور جاگیردار تھے۔ پاکستان بن گیا، نہ اسلام کا کچھ بنا، نہ مسلمانوں کا مگر جو کچھ بنا، وہ جاگیرداروں کے لیے بنا۔ جن لوگوں نے اس ملک کی آزادی کے لیے کوشش کی۔ ان کی مٹی پلید ہو گئی۔ کسی نے ان لوگوں سے یہ تک نہ پوچھا کہ ان لوگوں نے اتنی محنت کی، قید کاٹی، لاٹھیاں کھائیں خدا آپ کا بھلا کرے، آپ نے یہ کام کیا۔ اب آپ کا کیا حال ہے؟

جناب محمدّ مسعود صاحب

جناب محمد مسعود صاحب، حسین شہید سہروردی صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے تقسیم ہند تک ان کی خدمات سرانجام دیتے رہے میری ان سے ملاقات پنڈی میں اس وقت ہوئی جب قائداعظم کا صدسالہ جشنِ ولادت منایا گیا تھا۔ یہ ملاقات ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں ہوئی تھی۔ دسمبر ۱۹۷۶ء کی یہ بات ہے جس کا حال نذرِ قارئین کرتا ہوں۔

جناب مسعود صاحب نے متحدہ بنگال کی تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اس تحریک میں سہروردی صاحب کے ہمنوا کچھ مسلم لیگی رفقاء کار بھی تھے۔ جس میں فضل الرحمن اور ابوالہاشم صاحب نمایاں تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ تھے! ادھر بنگال کانگرس پارٹی میں کرن شنکر رائے صاحب تھے جو بنگال کانگریس پارلیمانی پارٹی کے لیڈر تھے۔ سہروردی صاحب کے ان کے ساتھ پرانے تعلقات تھے، لہٰذا ان دو حضرات نے بیٹھ کر بات کی۔ جس میں اور حضرات بھی شریک تھے۔ جناب سرت چندر بوس بھی شامل تھے۔ یہ تحریک اس وقت زیادہ قوی ہو گئی جب بنگال کو تقسیم کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا، دونوں طرف ایسے لوگ تھے جو بنگال کی اس تقسیم کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان حضرات کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اس تقسیم کو کس طرح روکا جائے۔ ہندوؤں

کی اپنی وجوہات تھیں اور مسلمانوں کی اپنی۔ مگر شیاما پرشاد مکرجی صاحب جو کہ مہاسبھا کے لیڈر تھے اس تحریک کے سخت مخالف تھے۔

جب تقسیم کی تحریک تیز ہونے لگی تو اس وقت سہروردی صاحب اور ان حضرات کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا کہ بنگال تقسیم نہ ہو بلکہ خود مختار، آزاد ایک علیحدہ ریاست ہو جائے۔

ان لوگوں سے معاہدہ کرنے کے بعد سہروردی صاحب نے دہلی میں قائداعظم سے آ کر اس مسئلہ پر بات چیت کی۔ یہ کوئی ۹ یا ۱۰ اپریل ۴۷ء ۱۹ کی بات ہے سہروردی صاحب نے اپنا تمام ذہن کھول کر سارا مسئلہ قائداعظم کے سامنے پیش کیا کہ کس طرح یہ بات مسلمانوں کے لیے مفید ہو گی۔ اس پر قائداعظم نے کہا کہ "میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ بات چیت کو آگے بڑھاؤ۔ لیکن کسی بات کا اس وقت تک وعدہ نہ کرنا۔ جب تک کہ مجھ سے مشورہ نہ کر لو" لیکن میں یہ بات بتانا چاہتا ہوں سہروردی! کہ کانگرس اس بات پر راضی نہ ہو گی۔ اس کے بعد اسی دن سہروردی صاحب کی ملاقات لیاقت علی خاں صاحب سے اور فضل الرحمٰن صاحب سے ہوئی۔ لیاقت علی خاں نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا۔ پھر اسی دورہ میں ان کی ملاقات لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ہوئی مگر انہوں نے اس مسئلہ پر کوئی کمٹ منٹ نہیں کیا۔

پھر سہروردی صاحب واپس کلکتہ تشریف لائے اور کرن شنکر رائے اور گھوش صاحب دلی گئے۔ دلی سے واپسی پہ کرن شنکر رائے صاحب نے بتایا کہ کانگرس اس بات کے لیے راضی نہیں ہے۔ پھر سرت چندر بوس گئے۔ انہوں نے کوشش کی مگر مرکزی کانگرس نے اس تجویز کو ناپسند کیا جس پر حقیقتاً وہ لوگ سرت چندر بوس سے سخت ناراض ہو گئے۔ بس بات وہیں رہ گئی۔

اس تجویز پر جب معاہدہ ہوا تھا تو عارضی طور پر ایک دستاویز بھی تیار کی گئی تھی۔

اس میں دس گیارہ شقیں تھیں۔ کم و بیش یہ دستاویز آئرلینڈ کی طرز DE VELIRA کے اعلان پر تیار کیا گیا تھا۔ اس دستاویز میں جو نام تجویز کیا گیا تھا۔ وہ "خود مختار سوشلسٹ ری پبلک آف بنگال" تھا۔ اس وقت بنگال کی آبادی ساٹھ ملین افراد پر مشتمل تھی۔ غیر تقسیم شدہ بنگال کے ذرائع پیداوار بڑے تھے۔ ہر لحاظ سے اس کی اقتصادیات مستحکم ہوتی۔

سہروردی اور دیگر مسلم لیگی حضرات کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اگر بنگال تقسیم ہو جاتا ہے تو مشرقی بنگال کا علاقہ غیر ترقی یافتہ ہے اور یہاں پر آبادی کی اکثریت کے لئے زمین بھی اچھی نہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت پس ماندہ ہو کر رہ جائے گی۔

دوسری طرف مشرقی بنگال کے ہندوؤں کا بنگال کانگرس پر بڑا کنٹرول تھا ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ اگر بنگال تقسیم ہو گیا تو مشرقی بنگال میں ہندوؤں کی حیثیت بہت کمزور ہو جائے گی، مغربی بنگال میں تناسب ہندوؤں کا زیادہ تھا۔ لہٰذا متحدہ بنگال میں اجتماعی حالت اتنی کمزور نہیں ہو گی۔ کیونکہ ۴۴٪ ہندو تھے اور اقتصادی طور پر اور تعلیمی طور پر مسلمانوں سے ہندو بہت آگے تھے۔ اس واسطے ہم ان کو کنٹرول کر لیں گے۔

مسلمان جو تھے ان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ابھی ان کی تعداد ۵۶٪ ہے آبادی مسلمانوں کی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی لہٰذا توقع تھی کہ دس پندرہ سالوں میں آبادی ۶۰٪ ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اکثریت زیادہ ہو جائے گی۔ اس طرح مسلمان اپنی اکثریت کے بل بوتے پر طاقت کو اپنے ہاتھ میں رکھ سکیں گے۔ تعلقات پاکستان کے ساتھ بہتر رہیں گے اور ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بھی اچھے رہیں گے۔ اس کا اثر بہار، یوپی، آسام کے لوگوں پر بہتر پڑے گا۔ جدید واقعات نے تو یہ بات ثابت کر دی کہ وہ تجویز بہت ہی بہتر ہوتی۔

حسین شہید سہروردی صاحب نے لیاقت علی خاں کو دو خطوط لکھے تھے جو کہ ۱۲ مئی ۱۹۴۷ء کو تحریر کیے گئے۔ ایک مشترکہ اعلامیہ تھا جو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ لیاقت علی خاں اور سہروردی میں ذاتی تعلقات کشیدہ تھے میں ان باتوں کو جانتا ہوں لیکن میں بیان نہیں کر سکتا ہوں۔

میجر جنرل اکبر رنگروٹ

میجر جنرل اکبر رنگروٹ پہلے اور آخری ہندوستانی سپاہی تھے جن کو
کنگز کمیشن ملا تھا۔ پاکستان کے قیام کے وقت وہ قائداعظم کے
اے۔ڈی۔سی تھے۔ گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خاں صاحب ان
کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ ایک عام فوجی کی حیثیت سے
بھرتی ہوئے تھے۔ اس وقت ایک ہندوستانی سپاہی کو ۱۲ روپیہ ماہانہ تنخواہ
ملتی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں انہوں نے ترکوں کی لڑائی کے دوران ایک انگریزی
بریگیڈ کو تباہی سے بچایا تھا جس کے عوض ان کو کمیشن ملا تھا۔ میری جنرل
صاحب سے ملاقات ان کی لال حویلی کراچی میں ہوئی تھی۔ جس کا حال قلم بند کر
رہا ہوں۔ یہ ملاقات اپریل ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم کی رسمِ حلف وفاداری کا حال بیان کرتے ہوئے جنرل
اکبر صاحب نے فرمایا کہ ۱۴ اگست کو قائداعظم محمد علی جناح نے بحیثیت گورنر جنرل پاکستان حلفِ
وفاداری اٹھانا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اختیارات کو منتقل کرنے کے لیے تشریف لا چکے تھے۔
ہم نے قائداعظم اور ماؤنٹ بیٹن صاحب کو اسمبلی ہال لے کر جانا تھا۔ روانگی سے قبل لارڈ ماؤنٹ
بیٹن نے ایک لفافہ قائداعظم کے حوالے کیا اور کہا کہ آپ اس کو پڑھ لیں۔ یہ پاکستان کے خلاف

پہلی سازش تھی۔کیونکہ اس دستاویز میں ماؤنٹ بیٹن نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں ایسی ترامیم کر دی تھیں۔جس کے تحت گورنر جنرل کے اختیارات محض نمائشی ہو کر رہ گئے تھے اور کابینہ کو بہت اختیارات دے دیے تھے۔ان ترامیم کے ذریعہ قائداعظم کو صرف ایک دستوری گورنر بنا دیا گیا تھا اور سارے اختیارات کابینہ کو دے دیے تھے۔ماؤنٹ بیٹن صاحب کی اس کارروائی کا مقصد یہ تھا کہ کابینہ اور گورنر جنرل کے مابین محاذ آرائی جاری رہے۔ان ترامیم کی رُو سے نہ ہی فوج، نہ ہی نیوی اور نہ ہی پولیس گورنر جنرل کے ماتحت تھی اور کابینہ کو بھی گورنر جنرل معطل نہیں کر سکتا تھا۔نہ ہی وہ دستوری ترامیم کر سکتا تھا۔قائداعظم نے جلدی سے اس دستاویز کو پڑھ کر جیب میں ڈال لیا۔اور روانگی کا حکم دے دیا۔ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم سے یہ بھی کہا تھا کہ خفیہ اطلاعات کے پیش نظر آپ اسمبلی ہال تشریف نہ لے جائیں۔کیونکہ راستہ میں قاتلانہ حملہ کا خطرہ ہے۔بہتر یہ ہے کہ رسمِ حلفِ وفاداری گھر ہی میں منعقد کی جائے مگر قائداعظم نے ان کے اس مشورہ کو قبول نہ کیا۔اس پر ماؤنٹ بیٹن صاحب نے کہا تو پھر راستہ میں حفاظت کے لیے میں برطانوی سپاہی تعینات کرنے کا حکم دے سکتا ہوں مگر ان کی اس پیشکش کو بھی قائداعظم نے قبول نہیں فرمایا اور گاڑی کو اسمبلی ہال کی طرف چلنے کا حکم دے دیا۔

جنرل اکبر خاں صاحب نے پاکستان بننے کے بعد پہلی دفعہ فوج کی طرف سے سیاست میں مداخلت کی ناکام کوشش پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ قائداعظم کی وفات کے بعد میں نے حکومت کا تختہ الٹنے کی ایک فوجی سازش کو ناکام بنا دیا۔فوج کے اسی (۸۰) افسران نے ایک دستاویز پر دستخط کر کے مجھ سے درخواست کی تھی کہ لیاقت علی خاں صاحب کو ہٹا کر اقتدار پر قبضہ کر لوں۔ان اعلیٰ افسران میں فوج، نیوی اور ائیرفورس کے افراد شامل تھے۔میرے پاس جب یہ لوگ درخواست لے کر آئے تو میں نے کہا کہ اگر آپ کی یہ درخواست گورنر جنرل کے پاس جاتی ہے تو آپ سب لوگوں کو بغاوت کے الزام کے سلسلہ میں گولی مار دی جائیگی لیکن انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ پر ایک بھائی کی طرح اعتماد کیا ہے۔اس پر میں نے ان سے

کہا کہ میں اس مسئلہ کو یہیں پر دفن کرتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے حکومتِ پاکستان کو فوج میں بے چینی سے آگاہ کیا۔ تاکہ ایسے اقدام کیے جائیں کہ فوج مطمئن رہے۔ مگر درخواست گزاروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ جنرل صاحب نے بڑے افسوس کے ساتھ اس امر کا انکشاف کیا کہ بہت سے اہم کاغذات ان کے گھر سے چوری ہو گئے۔ ان کاغذات میں ایک ایسا پیغام بھی تھا جس میں ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے تمام کور کمانڈروں کو کشمیر پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔

جنرل اکبر صاحب نے سہروردی صاحب کے عہد کے ایک واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔ کہ یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ جب سہروردی صاحب وزیر اعظم ہو گئے تو انہوں نے کرنل[1] الٰہی بخش کو بلایا اور کہا کہ آپ کا کچھ قرض میرے ذمہ ہے۔ فرمائیے کتنی رقم ادا کروں؟ یہ سن کر کرنل الٰہی بخش نے کہا کہ

"میں نے آپ کا علاج بحیثیت ایک دوست کے کیا تھا میں نے پیسوں کے لالچ میں آپ کا علاج نہیں کیا تھا۔ دوستوں کا حساب دل میں ہوتا ہے۔ اس بات کو آپ بھول جائیے۔"

یہ سن کر سہروردی صاحب پھڑک اٹھے۔ فوراً اٹھ کر الماری کی طرف بڑھے اور ایک فائل نکال کر لائے اور کہا کہ اس فائل پر لیاقت علی خاں صاحب نے راولپنڈی سے واپس آکر دستخط کرنے تھے۔ اس فائل میں یہ حکم نامہ تحریر تھا کہ کرنل الٰہی بخش کا پریکٹس کرنے

---

[1] کرنل الٰہی بخش ایک مشہور معالج تھے۔ قائد اعظم کے آخری زمانہ میں انہوں نے ان کا علاج کیا تھا۔ اور قائد اعظم کے انتقال کے بعد ایک کتاب لکھی جس میں قائد اعظم کے آخری دنوں کا حال بیان کیا ہے۔ کتاب پڑھنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حکومت نے قائد اعظم کے علاج میں غفلت برتی ہے۔ کتاب کا نام ہے LAST DAYS WITH QUID-A-AZAM

کا لائسنس ضبط کر لیا جائے۔ اس کے بعد سہروردی صاحب نے وہ فائل ختم کر دی اور اس پہ لکھ دیا کہ اس میں بیکار چیز تھی۔

جنرل صاحب نے گاندھی جی کے بارے میں فرمایا کہ گاندھی جی کو او۔بی۔ای کے تمغہ سے جنگِ عظیم اول میں نوازا گیا تھا۔ یہ انگریزوں کی خدمت گزاری کا صلہ تھا۔ گاندھی جی ذات کے بنیئے تھے۔ انگریز ان کو آگے لائے۔ خان عبدالغفار خاں کے بارے میں جنرل صاحب نے فرمایا کہ وہ ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی کے زیرِ اثر آئے۔ باچہ خاں کا خطاب غفار خاں کو مولانا محمد علی جوہر نے دیا تھا اور ان کی شادی بھی حاجی ترنگ زئی کی دختر سے انہوں نے کرائی تھی۔

ORDER OF BRITISH EMPIRE

ڈاکٹر عمر حیات ملک پنجاب

جناب ڈاکٹر عمر حیات ملک سرگودھا میں ایک زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ماہر تعلیم تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی کے رکن تھے۔ انڈونیشیا، مغربی جرمنی اور جاپان میں پاکستان کے سفیر رہے ہیں۔ عمر کے آخری ایام پشاور یونیورسٹی میں گزارے۔ کتے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ پشاور ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ پشاور یونیورسٹی میں قیام پذیر تھے۔ وہیں پر میری ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔

قائداعظم محمد علی جناح سے اپنے تعلقات کا حال بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عمر حیات صاحب نے فرمایا کہ جب ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان پاس ہوگئی اور پاکستان کی تحریک تیز تر ہونے لگی تو میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔ کہ دیکھیں تو سہی جناح صاحب کیسے آدمی ہیں؟ کیا ہیں؟ لیڈر بن کر ابھرے ہیں۔ لہٰذا میں اس خواہش کے تحت ان سے ملنے کے لیئے ہو سے دہلی گیا۔ ان دنوں وہ لیاقت علی خاں کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان سے کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے جناح صاحب سے کہا کہ صاحب! ہمارے پاس نہ تو کوئی فوج ہے، نہ ہتھیار ہیں کہ ہم پاکستان کے حصول کے لیے جنگ کر سکیں۔ کم از کم یہ تو ہونا چاہیئے کہ اپنے پروپیگنڈے کے لیے ہمارے پاس کوئی اخبار ہو۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا کوئی انگریزی

روزنامہ شائع نہیں ہوتا تھا، ہمارا ایک روزنامہ اخبار ہو جس کے ذریعہ ہم اپنا نقطۂ نظر بیان کر سکیں، اس لیے اگر آپ اخبار کے لیے قوم سے اپیل کریں تو لوگ ضرور اس معاملے میں مالی امداد کریں گے۔ یہ سن کر مسٹر جناح کہنے لگے کہ روپیہ تو میں جمع کر سکتا ہوں مگر مجھے ایسے لوگ نظر نہیں آتے جن کے پاس روپیہ رکھوا سکوں۔

ڈاکٹر عمر حیات صاحب سے یہ بات سن کر میں نے مؤدبانہ طریقہ سے یہ سوال کیا کہ جناب! مسلمانوں میں قحط الرجال کی کیا وجہ ہے؟ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مسلمانوں میں ہمیشہ بادشاہت رہی ہے اور بادشاہوں کی وجہ سے مسلمانوں کی کردار سازی نہیں ہو سکی۔ مولوی صاحبان وہی کرتے تھے جو بادشاہوں کا حکم ہوتا تھا۔ وہ اس کے حکم کے پابند ہوتے تھے۔ ہماری ساری تاریخ ایسی ہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی حقیقی آزادی دیکھی ہی نہیں تھی۔ کبھی سکھوں کے غلام تو کبھی انگریزوں کے۔ مسلمانوں میں قابل آدمی تھے ہی نہیں۔ جناح صاحب میں خوبیاں تھیں، انھوں نے جو بات کی اس پر قائم رہے۔ نہ ان میں زر پرستی تھی نہ جاہ پرستی تھی۔ جاہ پرستی تھی تو پاکستان کے ساتھ تھی۔ ہندوؤں کے کہنے پر نہ تھی۔ جس وقت پاکستان بنا وہ اتنے بیمار تھے کہ تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ مسلمان پہلے اپنے آپ کو ایک کمیونٹی سمجھتے تھے۔ وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانو! تم ایک کمیونٹی نہیں ہو بلکہ ایک قوم ہو۔ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو ایک علیحدہ قوم ہونے کا تصور بخشا۔ پاکستان بننے کے بعد جب میں قائداعظم سے ملنے کے لیے کراچی گیا تو اس وقت پنجاب میں دولتانہ ممدوٹ کا جھگڑا شروع ہو چکا تھا۔ وہ پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ آپ لاہور سے آ رہے ہیں۔ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ پاکستان کو بنے ہوئے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ وہ بہت پریشان تھے۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے مسلم لیگ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا

کہ قائداعظم ہی لیگ تھے۔ جو کچھ وہ کہتے تھے وہ ہو جاتا تھا۔ عملی طور سے قائداعظم ہی مسلم لیگ تھے۔ یہ مجھے یقین ہے کہ کسی شخص میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ جناح صاحب کی مرضی کے خلاف چلے۔ میرا خیال ہے کہ لوگوں کو ان سے عقیدت بھی تھی۔ ان کی بات بھی مانتے تھے اور ان کا رعب بھی تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے اس وقت تک لیگ کے اندر کوئی ایسی حلقہ بندی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ لیاقت علی خاں جب تک زندہ رہے ان کا بھی اتنا رعب تھا کہ سوائے سہروردی صاحب کے اور کوئی ان کی مخالفت میں آواز نہ بلند کر سکا۔

قائداعظم اور لیاقت علی خاں کے تعلقات کے بارے میں ڈاکٹر عمر حیات نے فرمایا کہ ایک دن لیاقت علی خاں صاحب سے ملنے گیا۔ تو انہوں نے کہا کہ جناح صاحب کہتے ہیں کہ جو آفیسرز مقرر کریں تو پہلے ان لوگوں کے نام منظوری کے لیے ان کے پاس بھیجے جائیں۔ یہ بات لیاقت علی خاں صاحب کو پسند نہ تھی۔ گو اس کا اظہار انہوں نے نہیں کیا۔ لیکن میں سمجھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے غلام محمد صاحب کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جناح صاحب نے پاکستان بننے سے پہلے ایک مرحلے پر مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل کے عہدے کی پیش کش غلام محمد صاحب کو کی تھی۔ میں اس موقعہ پر غلام محمد صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت جناح صاحب نے غلام محمد سے فون پر بات کی۔ میں جناح صاحب کی بات کو نہیں سن رہا تھا البتہ غلام محمد کی بات سن رہا تھا۔ اس گفتگو سے میں اندازہ لگا سکتا تھا۔ پھر غلام محمد نے خود بھی مجھے بتایا لیکن غلام محمد خود ہی پیچھے ہٹ گئے کیونکہ اس وقت ان کو نوکری چھوڑنی پڑتی تھی۔ غلام محمد ایک مطلبی انسان تھے۔ حالانکہ میرے ان کے ساتھ علی گڑھ کے زمانہ سے تعلقات تھے۔ مگر میں ان کی پالیسیوں کو پسند نہیں کرتا تھا

نیز ڈاکٹر عمر حیات صاحب نے "قراردادِ مقاصد" کے بارے میں یہ فرمایا کہ اس قرارداد کو اسمبلی سے پاس کرانے والے وہ خود تھے۔ ان کو مولانا شبیر احمد عثمانی کی حمایت حاصل تھی جبکہ مسلم لیگ ہائی کمان اور یہاں تک کہ لیاقت علی خاں خود بھی اس سلسلہ میں کسی گرم جوشی کا

مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ غلام محمد صاحب اور اس کے ہمنوا اس قرارداد کے سخت مخالف تھے۔ ان حضرات نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ قرارداد کی مخالفت کریں گے۔ مگر بعد میں لیاقت علی خاں صاحب کے ساتھ یہ بات طے ہوئی کہ یہ قرارداد دستور کا حصہ نہیں ہوگی بلکہ آئین کے PREAMBLE میں شامل ہوگی۔ پری ایمبل میں جو چیز ہوتی ہے وہ قانون کا حصہ نہیں ہوتی۔ قرارداد پاس ہونے کے بعد ڈاکٹر عمر حیات صاحب سے ایک صاحب[۱] نے کہا کہ ہم نے ایک ایسی چال چلی ہے۔ کہ قرارداد پاس بھی ہو جائے اور بیکار بھی ہو جائے ہم نے اس کو PREAMBLE میں رکھ دیا ہے جس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ پھر ڈاکٹر عمر حیات صاحب نے ایک اور صاحب کے بارے میں کہا کہ آپ تو دعویٰ کرتے تھے کہ اسلامی حکومت بنائیں گے، اسلامی قانون بنائیں گے اور یہ کریں گے وہ کرینگے مگر اب آپ میری مخالفت کر رہے ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ تو ان صاحب نے جواب دیا وہ باتیں میں صاف دلی سے نہیں کر رہا تھا۔ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر عمر حیات صاحب نے کہا کہ ایک دن غلام محمد صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ مولوی کو تو ہم مان لیں آپ کے نہ داڑھی، نہ مونچھ، پتلون آپ پہنتے ہیں۔ ایک دن خواجہ ناظم الدین صاحب نے ڈاکٹر عمر حیات صاحب سے پوچھا کہ جب اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی تو ہم عورتوں سے ہاتھ نہیں ملا سکیں گے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ دستانے پہن کر البتہ ہاتھ ملا سکتے ہیں۔

---

[۱] میں نے ان صاحب کا نام معلوم کرنا چاہا مگر ڈاکٹر صاحب نے نام بتانے سے معذرت چاہی۔

جناب حمید الحق چودھری بنگال

جناب حمید الحق چودھری صاحب کا تعلق بنگال سے تھا۔ وہ ایک بڑے کامیاب وکیل تھے۔ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے، مولوی فضل الحق کی جماعت سے وابستہ تھے۔ ۱۹۵۴ء میں ۲۱ نکات کی تشکیل میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ اخبار "آبزرور" کے مالک تھے جو ڈھاکہ سے شائع ہوتا تھا۔ چودھری ظفر اللہ خاں کے بعد وہ پاکستان کے دوسرے وزیر خارجہ بنے تھے، پاکستان کے ٹوٹ جانے کے بعد کراچی میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہوا تھا۔ کراچی ہی میں میری ان سے ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ۷ جولائی ۱۹۷۴ء کو پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

جناب حمید الحق چودھری صاحب نے قائد اعظم اور لیاقت علی خاں کے مابین تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ لیاقت علی خاں کی یہ خواہش تھی کہ اختیارات ان کے ہاتھ میں ہوں، ادھر مسٹر جناح کی یہ سوچ تھی کہ ان کی ہدایات پر توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ ان کو نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ یا ان کو تاریکی میں رکھا جا رہا تھا جب حکومت قائم ہو گئی تو قدرتی طور پر لوگوں کا تعلق لیاقت علی خاں سے زیادہ تھا کیونکہ انتظام وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کے ہاتھ میں تھا۔ فطری طور پر طاقت کا مرکز وزیر اعظم کی طرف

منتقل ہوگیا۔ لیاقت علی خاں اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو اور اپنی بیگم کو مضبوط کر رہے تھے۔ پھر کشمیر کے معاملہ نے نازک صورت اختیار کر لی۔ جناح صاحب کشمیر کے سلسلہ میں فوجی کارروائی کے حق میں تھے۔ لیکن لیاقت علی خاں کی رائے اس کے برخلاف تھی۔ کچھ افراد ایسے بھی تھے جو لگائی بجھائی کر رہے تھے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ تعلقات میں کشیدگی کی صورت میں برآمد ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد مسٹر جناح چاہتے تھے کہ اقلیتوں کو زیادہ سے زیادہ نئی ریاست میں ضم کیا جائے۔ وہ اس بات کے حق میں تھے کہ اقلیتوں کے برابر کے حقوق ہوں لیکن یہ بات ان لوگوں کو ناپسند تھی جو ہجرت کر کے پاکستان منتقل ہوئے تھے۔ دراصل یہ حضرات اقلیتوں کو ہندوستان میں دھکیلنے کے حق میں تھے اور زیادہ سے زیادہ ان کو نچوڑنے کی فکر میں تھے۔

۱۹۵۴ء میں مشرقی بنگال میں ہونے والے عام انتخابات پر تبصرہ کرتے ہوئے حمید الحق صاحب نے فرمایا کہ یہ انتخاب مسلم لیگ سے نفرت کی بنیاد پر لڑا گیا تھا اس محاذ آرائی میں حسین شہید سہروردی صاحب اس وقت شریک ہوئے۔ جب سب کچھ تیار ہو چکا تھا۔ ہم لوگوں نے ۲۱۔ نکات تشکیل کیے تھے اور ان نکات میں میری فطری دلچسپی تھی کیونکہ آئینی معاملات کو میں دیگر حضرات کے مقابلے میں زیادہ سمجھتا تھا اور دوسرے حضرات بھی میری رائے کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں بنگال کی سرکاری مشینری رائے عامہ کے ساتھ چل رہی تھی۔ انتخابات میں ہیرا پھیری نہیں ہوئی تھی اور اس بارے میں کسی طرف سے کوئی آواز بھی نہیں سنی گئی۔ انتخابات میں دھاندلی کا احتمال حکومت کی طرف سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس وقت مسلم لیگ کی حکومت برسر اقتدار تھی۔ مگر وہ اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھانے سے قاصر تھی۔ اور دوسری بات یہ کہ وہاں کے سرکاری ملازم اتنا اثر و رسوخ اور اختیار نہیں رکھتے جتنا کہ مغربی پاکستان میں، خصوصاً پنجاب میں۔ پنجاب

کے مالیہ کے انتظام میں تحصیلدار کے بڑے اختیارات ہیں، اسی طرح پولیس کے بھی وسیع اختیارات ہیں۔ یہ ملازمین سرکاری پسند و ناپسند کو لوگوں پر مسلط کر دیتے ہیں۔

غلام محمد صاحب اور لیاقت علی خاں صاحب کے تعلقات کے بارے میں حمید الحق صاحب نے فرمایا کہ غلام محمد کی یہ کوشش تھی کہ تمام اختیارات ان کے اپنے ہاتھوں میں آجائیں اور لیاقت علی خاں صاحب کی یہ کوشش تھی کہ یہ لوگ آزاد آنہ کوئی اثر نہ رکھیں اس وجہ سے تعلقات میں حسد پیدا ہو گیا۔ نیز لیاقت علی خاں ان لوگوں پر پوری نظر رکھتے تھے جس کی وجہ سے یہ لوگ مایوس ہو رہے تھے۔

مشرقی پاکستان میں نور الامین صاحب وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ مسلم لیگ کی نمائندگی کر رہے تھے، عام انتخابات میں جگتو فرنٹ عظیم اکثریت سے جیت گیا تھا۔ ۳۱۰ نشستوں میں سے مسلم لیگ کو صرف ۹ نشستیں حاصل ہوئی تھیں۔ جگتو فرنٹ میں مشرقی پاکستان کی ۹ جماعتیں متحد ہو گئی تھیں۔

مشرقی پاکستان سے بدسلوکی کا ذکر کرتے ہوئے جناب حمید الحق چودھری صاحب نے بتایا کہ شروع ہی سے مرکزی حکومت میں کبھی کسی مشرقی پاکستانی کو وزارتِ خزانہ کا عہدہ نہیں سونپا گیا۔ یہ عہدہ مشرقی پاکستانی کو دیتے ہی نہیں تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں مرکزی وزیر خزانہ بنوں، جب ہم لوگ مرکز میں آئے اور ہمارے پارٹی سے حکومت کا معاہدہ ہو گیا تو مجھے نظر انداز کر کے جناب امجد علی کو وزیر خزانہ بنا دیا۔ جس پر میں نے فیروز خان نون سے سخت احتجاج کیا کہ یہ ہیرا پھیری کا سلسلہ اچھا نہیں ہم سے وعدہ خلافی کی گئی ہے۔

چودھری ظفر اللہ خاں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے حمید الحق صاحب نے فرمایا کہ ظفر اللہ خاں کی تمام تر توجہات کا مرکز کشمیر کا مسئلہ تھا جس کے سلسلہ میں وہ اقوامِ متحدہ میں اور سیکیورٹی کونسل میں مصروف عمل تھے۔ اس کے علاوہ

مجھے ان کی اور کوئی سرگرمی نظر نہیں آتی۔ بقول اسکندر مرزا اور دیگر حضرات کے ظفر اللہ خاں نے مشکل ہی سے ملک کی خارجہ پالیسی کے معاملے میں کسی سنجیدہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ جہاں تک ان کے لیے ممکن ہو سکا وہ زیادہ سے زیادہ وقت ملک سے باہر گزارنے میں مصروف رہے بقول اسکندر مرزا چونکہ ظفر اللہ خاں بالعموم ملک سے باہر رہتے تھے اس لیے وہ ملک کے وزیر خارجہ تھے۔

حمید الحق چودھری صاحب نے فرمایا کہ دراصل ظفر اللہ خاں کی برصغیر پاک و ہند میں برطانوی مفادات سے اتنی گہری وابستگی تھی کہ نہ ہی ذہنی طور سے اور نہ ہی عملی طور سے وہ اپنے آپ کو برطانوی اثرات سے آزاد کر سکتے تھے، ظفر اللہ خاں کی تمام ترقی اور تمام حیثیت انگریزوں کی مرہونِ منت تھی۔ جو رتبے ان کو ملے وہ برطانوی بخشیش تھیں۔ انگریزوں ہی نے ان کو چمکایا تھا۔ تقسیم ہند سے قبل ان کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ وہ وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے فیڈرل کورٹ کے جج تھے۔ غرضیکہ وہ اتنے اہم عہدوں پر صرف اس لیے تھے کہ وہ برطانوی مفادات کے پاسدار تھے۔ ایک ایسا شخص جس کی تمام زندگی ایک خاص نظریہ پر تعمیر ہوئی ہو اور خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ برطانوی مفادات کو ایک طرف ہندوؤں سے اور دوسری طرف مسلمانوں سے خطرہ لاحق ہو، ان کی برطانیہ کی خدمت گزاری قابلِ فکر بات ہے۔ پھر یہ کہ ایسے شخص کا برطانوی مفادات کی طرف شعوری یا غیر شعوری طور سے جھکاؤ کوئی تعجب کی بات نہ ہونا چاہیئے۔ ان پر برطانوی نوازشات پاکستان بننے کے بعد بھی جاری و ساری رہیں۔ ہیگ کی عدالت میں ان کو جج بنایا گیا۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو سیاسی طور پر انہوں نے نہ ملکی اور نہ ہی لوگوں کی کوئی خدمت سرانجام دی۔ تقسیم کے وقت نہ وہ مسلم لیگ میں تھے اور نہ ہی کسی اور جدوجہد میں شامل تھے البتہ وہ اپنے فرقہ کے معاملات میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ جب مجھے وزارتِ خارجہ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس وقت میں آئین سازی کے کام میں الجھا ہوا تھا۔ وزارتِ خارجہ کی حالت کا علم اس بات سے بخوبی ہو جائے گا

کہ ۱۹۵۵ء میں نہ تو اس وزارت کے پاس اپنی کوئی لائبریری تھی۔ نہ دستاویز رکھنے کا کوئی انتظام تھا اور نہ ہی کوئی معقول دفتر تھا۔ نہ ہی کوئی شعبہ تحقیق کا تھا۔ لکھا پیلس میں وزارتِ خارجہ کا دفتر تھا، وزیرِ خارجہ کا جو کمرہ تھا وہ گرد اور دھول سے اٹا پڑا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ برسوں کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ اس دفتر کا فرش اور باتھ روم میں نے درست کروائے۔

محمد علی بوگرہ کو بحیثیت وزیرِ اعظم لانے والے چودھری ظفر اللہ تھے اور جہاں تک لیاقت علی خاں صاحب کے دورۂ روس کو ختم کرانے کا تعلق تھا اس میں بھی فطری طور پر چودھری ظفر اللہ خاں کا ہاتھ تھا کیونکہ بقول حمید الحق چودھری صاحب کے اس قسم کے تمام معاملات وزیرِ خارجہ ہی کے شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

جناب حمید الحق چودھری صاحب نے اسپیکر کے عہدے کے تقدس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ برطانیہ میں جونہی اکثریتی پارٹی اسپیکر کو منتخب کر لیتی ہے وہ اپنے آپ کو پارٹی کے معاملات سے بالکل الگ کر لیتا ہے۔ اور وہ غیر جماعتی شخص بن کر ہاؤس میں وقار اور انصاف کو قائم کرتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے یہاں اعلیٰ جمہوری اقدار کی روایت نہ پڑ سکی۔ بقول حمید الحق چودھری صاحب کے اسپیکر جناب مولوی تمیز الدین اہم معاملات میں وزیرِ اعظم سے مشورہ کے بعد ہاؤس میں عمل کرتے تھے۔

جناب صدر ایوب کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے حمید الحق چودھری صاحب نے فرمایا۔ کہ جب ایوب خاں جی۔ او۔ سی بن کر مشرقی پاکستان آئے تب ہی سے انہوں نے بیوروکریسی کے ساتھ تعلقات ہموار کرنے شروع کر دیے تھے۔ ذاکر حسین صاحب ان میں سے ایک تھے۔ ایک دو حضرات اور تھے۔ ان کے علاوہ ایک بڑے مالدار اور ممتاز شخص آر۔ بی شاہ تھے۔ جو ایوب خاں کے بہت قریب تھے۔ انہوں نے ایوب صاحب کے لیے ایک بہت بڑی ہاؤس بوٹ مخصوص کرا رکھی تھی۔ وہ ایک مخیّر انسان تھے اور انہوں نے جنگِ عظیم کے زمانہ میں بڑی دولت کمائی تھی۔ میمن سنگھ میں ہزار

بستروں کا ایک ہسپتال قائم کیا تھا۔ ایک کالج اور ایک اسکول بنوایا تھا۔ اس زمانہ میں یحییٰ خان صاحب کی شامیں ہاؤس بوٹ میں گزرا کرتی تھیں۔ شراب وغیرہ کے تمام اخراجات آر بی شاہ ادا کرتے تھے۔ نارائن گنج میں بڑی رنگین شامیں اور صحبتیں قائم کی جاتی تھیں۔ آر بی شاہ عوامی لیگ کے بڑے مربّی تھے۔ اور اس جماعت کی مالی امداد کرتے تھے۔ اسی تعلق کی وجہ سے ۱۹۷۰ء میں فوج نے ان کو مار ڈالا تھا۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی ہلاک کر دیا گیا تھا۔ میں چونکہ ان کا وکیل رہا ہوں اس لیے مجھے ان کے تمام اندرونی معاملات کا بخوبی علم ہے۔

٭

ایم، ایس، طوسی وزیرآباد

جناب ایم' ایس طوسی صاحب وزیرآباد کے رہنے والے تھے۔ پاکستان بننے سے قبل ان کے مضامین سول اینڈ ملٹری گزٹ میں چھپتے تھے۔ ان کا قلمی نام "پنجابی" تھا۔ ان کے مضامین بڑے دلچسپ اور تاریخی اہمیت کے حامل ہوتے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح ان کے مضامین پڑھا کرتے تھے۔ لہذا انہوں نے اخبار کے ایڈیٹر سے رابطہ قائم کیا اور جناب ایم ایس طوسی صاحب کا پتہ معلوم کرنا چاہا۔ اس طرح طوسی صاحب کے ساتھ قلمی دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ جو بعد میں قربت کا اور محبت کا رشتہ بن گیا۔ تعلقات اتنے بڑھے کہ طوسی صاحب کو کئی مرتبہ قائداعظم محمد علی جناح کا مہمان ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ بمبئی میں بھی قائداعظم کے مہمان ہوئے اور دہلی میں بھی ان کے ساتھ رہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور ورکنگ کمیٹی کے کئی اہم اجلاس میں بھی شرکت کی بحیثیت ایک مبصّر کے۔ قائداعظم کو انہوں نے بڑے قریب سے دیکھا تھا اور ان کی نجی زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتے تھے۔ وہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد ان کو قائداعظم سے ملنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ البتہ محترمہ فاطمہ جناح

سے ان کے مراسم ان کی حیات تک قائم رہے۔ جناب طوسی صاحب
سے میری ملاقات ان کے دولت خانہ وزیرآباد ہی پر ہوئی۔ جس کا مختصر
حال قلم بند کر رہا ہوں۔ ۱۴ فروری ۱۹۷۴ء کو وزیرآباد میں ان کی رہائش گاہ
پر ملاقات ہوئی تھی۔

جناب ایم۔ ایس طوسی صاحب نے قائداعظم محمد علی جناح صاحب کے
ساتھ اپنے تعلقات کا حال بتاتے ہوئے فرمایا کہ ۱۹۳۹ء میں میرا تعلق قائداعظم کے
ساتھ قائم ہوا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں قائداعظم کے پاس بمبئی گیا۔ اپنے قیام کے دوران میں
نے ان کی کتابوں کی ایک فہرست تیار کی۔ ان کی لائبریری میں اس وقت ڈیڑھ دو سو کے
لگ بھگ کتابیں تھیں، پھر دہلی میں بھی رابطہ قائم رہا۔ قائداعظم کی نجی زندگی کے بارے
میں طوسی صاحب نے فرمایا کہ انھوں نے اپنی زندگی کو ایک خاص اسلوب سے ڈھالا
ہوا تھا۔ مجھے ان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ بمبئی میں میں نے دیکھا کہ صبح
چھ سات بجے اپنے دفتر میں تشریف لے آتے تھے۔ اخبارات کا مطالعہ کرتے۔ اس
وقت ان کی پریکٹس برائے نام تھی۔ زیادہ تر توجہ سیاست پر مرکوز کئے ہوتے تھے۔ صبح
چھ بجے سے لے کر گیارہ بجے تک اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے، اس دوران میں
چائے پیتے۔ وہ تمام اخبارات کو پڑھتے تھے۔ دس پندرہ اخبارات آتے تھے۔
جن باتوں کا جواب دینا مقصود ہوتا ان پر سرخ پنسل سے نشان لگاتے تھے۔ اخبارات
سے فارغ ہو کر ڈاک دیکھتے تھے۔ ہر ایک خط کو خود پڑھتے تھے۔ جن خطوط کا جواب
دینا ہوتا ان کو ایک طرف رکھتے جاتے۔ پھر کچھ دیر کے بعد چائے آجاتی، چائے پیتے،
اپنے کلرک کو بلا کر جواب ٹائپ کرواتے۔ اخبارات اور خطوط سے فارغ ہو کر ملاقاتوں
کا سلسلہ شروع ہوتا۔ بعض اوقات ملاقاتیں بڑی طویل ہو جاتی تھیں جس پر محترمہ مس جناح
بڑا تلملاتی تھیں۔ ایک بجے تک وہ ان ملاقاتوں میں مصروف رہتے تھے۔ پھر کچھ آرام

کرتے۔ شام کو پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ کتابیں پڑھتے اور ملاقاتیں فرماتے جیسے اس شخص کو اس کے علاوہ کوئی اور کام ہی نہ تھا۔ نوجوان لڑکیاں ان کو فون کرتیں مگر کبھی انہوں نے ان کی ہمت افزائی نہیں کی۔ ایک مرتبہ ایک نوجوان لڑکی ان سے ملنے کے لیے آئی مگر دو منٹ کے بعد ہی وہ ملاقات ختم ہو گئی۔ ہم لوگ حیران تھے کہ کیا بات ہوئی۔ اتنے میں قائداعظم باہر تشریف لے آئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ لڑکی تو طویل ملاقات کے ارادے سے آئی تھی مگر آپ نے اتنی جلدی اس کو واپس کر دیا تو بولے کہ دراصل وہ لڑکی جاسوس تھی وہ مجھے ٹٹولنے کے لیے آئی تھی۔ میں نے اس کو صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک کانگرس پارٹی اپنا دل نہیں بدلتی اس وقت تک کوئی پیش رفت نہیں ہو سکتی اور پھر عورتوں سے سیاست پر بات کرنا بیکار ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی جیل میں تھے اور سپرو صاحب چاہتے تھے کہ جناح صاحب گاندھی جی کے حق میں بیان دیں۔ اسی زمانہ میں جناح صاحب مولوی فضل الحق صاحب سے ناراض تھے اور ان سے تنازعہ شروع ہو چکا تھا۔

جناح صاحب میں ایک خوبی یہ تھی کہ بلا وجہ کسی بات کی تفصیل میں نہیں جاتے تھے۔ موقعہ اور محل کے لحاظ سے بات کرتے تھے اور گفتگو کے دوران بنیادی اصول کو پیش نظر رکھتے تھے۔ جب بھی انہوں نے گاندھی جی سے بات کی ہمیشہ اصولوں پہ ہی بحث کی کہ مسلمان ایک قوم ہے اور مسلم لیگ ان کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کا ذہن بالکل صاف تھا۔ آپ کتنا ہی پیچیدہ اور الجھا ہوا مسئلہ ان کے سامنے رکھیئے وہ اس کو اپنے رنگ میں ڈھال کر صاف اور سیدھا کر دیتے تھے۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میری یادداشت بڑی تیز ہے اور چیزوں کو ان کے صحیح مقام پر رکھنے کا ملکہ حاصل ہے ان کا دماغ بہت صاف تھا۔ ان کی یادداشت بلا کی تیز تھی۔ جتنا زیادہ میں ان کے قریب ہوا اتنا ہی زیادہ وہ متأثر کرتے چلے گئے۔

میں چھوٹے چھوٹے واقعات سے قائد اعظم کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عید کا موقعہ قریب تھا۔ ان کا ایک ملازم تھا۔ جناح صاحب نے مجھ سے کہا دیکھئے یہ شخص میری بہن کے پاس گیا اور کہا کہ میں اپنے بچوں کو پشاور عید کی خوشی کے موقعہ پر پیسے بھیجنا چاہتا ہوں تو مجھے آپ تنخواہ پیشگی دے دیجئے۔ لہذا انہوں نے اس کو تنخواہ دے دی اور مزید دس روپے بخشیش کے طور پر بھی دے دیے۔ لیکن چند دنوں کے بعد میں نے یہ دیکھا کہ یہ شخص شاندار سلمی ستارہ کی جوتی اور پگڑی پہنے ہوئے اترا اترا کر پھر رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنے بیوی بچوں کے پاس روپے بھیج دیے ہیں۔ اس نے کہا۔ نہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ تم نے تمام رقم جوتوں اور پگڑی کی خریداری میں ضائع کر دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ شخص کتنا بے وقوف ہے۔ جبکہ ہم اس کو جوتے بھی دیتے ہیں۔ دوسری ضروریات بھی پوری کرتے ہیں۔ کپڑے بھی مہیا کرتے ہیں تو پھر اس کو یہ روپیہ ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ گھر خرچ نہیں بھیجا۔ یہاں اتراتا ہوا پھر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ مسلمانوں کا طریقہ ہے۔ یہ اپنے آپ کو حکمران قوم سمجھتے ہیں۔ اس پر جناح صاحب نے کہا کہ نہیں۔ سوال اس بات کا نہیں کہ آیا وہ حکمران قوم سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ ان لوگوں میں اپنے آپ کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت نہیں۔ اس وقت میں نے سوچا کہ اس شخص کے دل میں قوم کا کتنا خیال ہے۔

طوسی صاحب فرمانے لگے۔ ایک دن میں نے جناح صاحب سے پوچھا۔ کہ وہ تحریکِ خلافت سے کیوں علیحدہ رہے؟ اس پر انہوں نے فرمایا وہ علیحدہ تو نہیں تھے البتہ چند باتوں سے انہیں اختلاف تھا۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھ رہے تھے کہ گاندھی جی مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں اور علی برادران اس وقت گاندھی جی کی جیب میں تھے وہ نہایت ہوشیار انسان تھے۔ درحقیقت گاندھی جی تحریکِ خلافت کی آڑ میں انگریزوں کو یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ ہندوستان میں جو ہندو قومی تحریک ہے وہ انگریزوں کو سب

کچھ ان کے حوالے کر دینے پر مجبور کر سکتی ہے، اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو اپنا آلہ کار بنایا ہُوا تھا جس کو اس وقت کے جلیل القدر مسلمان رہنما نہیں سمجھ رہے تھے۔

جناب طوسی صاحب نے ایک اور واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ بمبئی میں تین چار نوجوان ڈیرہ دو دن سے جناح صاحب سے ملاقات کے لیے آئے میں نے ان نوجوانوں سے دریافت کیا کہ وہ کس سلسلہ میں جناح صاحب سے ملنا چاہتے ہیں وہ بولے ہم ان پر اعتراض کریں گے، وہ ہمارے رہنما بنتے ہیں مگر شریعتِ اسلامی کی پیروی نہیں کرتے، اس پر ان سے میری بحث شروع ہو گئی۔ ہم لوگ زور زور سے چیخ و پکار کرنے لگے اتنے میں مسٹر جناح اور ان کی ہمشیرہ ٹہلتے ہوئے آ گئے اور کہنے لگے مسٹر طوسی! آپ اتنی اونچی آواز سے کیوں چیخ و پکار کر رہے ہیں؟ مسئلہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ جناب یہ حضرات کہتے ہیں کہ آپ اسلامی اصولوں کی پیروی نہیں کرتے اس پر بحث ہو رہی ہے۔ جناح صاحب وہیں بیٹھ گئے اور ان سے یوں مخاطب ہوئے۔ میں اپنے آپ کو قائدِ اعظم نہیں کہتا ہوں، آپ لوگ خود کہتے ہیں، میں تو آپ کا مقدمہ انگریز حکومت سے لڑ رہا ہوں۔ ایک وکیل کو تین شرائط پوری کرنی چاہئیں پہلی بات یہ کہ وکیل اپنے مؤکل کو نہ نچوڑے، کیا میں آپ کو نچوڑ رہا ہوں۔ دوئم یہ کہ وکیل کو عدالت سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے تو کیا میں انگریز عدالت سے مرعوب ہوں اور سوئم یہ کہ وکیل کو اپنے موقف کی دلائل بہترین طریقے سے پیش کرنا چاہئیں تو کیا میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا رہا ہوں۔ اگر آپ کے پاس کوئی بہتر مولوی ہے تو اس کو سامنے آنا چاہیئے۔ میں مقدمہ کی پیروی سے دست بردار ہو جاؤں گا، جو کچھ میں کہتا ہوں وہ میں مسلم قوم کے مفاد میں کہتا ہوں اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ کوئی دوسرا آدمی مجھ سے بہتر طریقے سے مسلمانوں کے موقف کو پیش کر سکتا ہے تو اس کو آگے آنا چاہیئے میں دستبردار ہو جاؤں گا۔ طوسی صاحب کہنے لگے جناح صاحب بڑے سمجھ دار انسان تھے وہ اصولوں کی بات کرتے

تھے بلاوجہ تفصیل میں نہیں جاتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے جناح صاحب سے کہا۔ کہ مولانا ظفر علی خاں نے پنجاب میں بڑا کام کیا ہے ان کو ورکنگ کمیٹی میں رکھنا چاہیئے اس پر وہ بولے کہ ان کے اخراجات کو کون پورا کرے گا۔ طوسی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے جناح صاحب سے کہا کہ آپ جیل میں جانے سے ڈرتے ہیں، اس پر وہ بولے کہ بات یہ نہیں بلکہ اگر میں جیل میں جاؤں تو میرے لیے بہتر ہوگا، میں وہاں آرام کر سکوں گا۔ میں زندگی کو طول دے سکوں گا جس طرح انڈین لیڈرز جیل میں جاتے ہیں، جہاں وہ کتابیں لکھتے ہیں۔ گاندھی جی لکھتے ہیں، جواہر لال لکھ رہے ہیں۔ مجھے بھی جیل میں رہ کر کافی وقت مل جائے گا لیکن جس بات کی مجھے تشویش ہے وہ یہ کہ اگر ایک مرتبہ میں جیل میں گیا تو برطانوی حکومت مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر تحریک کو زبردست نقصان پہنچائے گی، یہ لوگ جو میں نے اکٹھے کئے ہیں سب تتر بتر ہو جائیں گے۔ کاش! میری قوم اچھے طریقے سے منظم ہوتی تو پھر جیل کیا چیز تھی میں کھل کر برطانیہ سے جنگ کرتا سینے پر گولی کھاتا تو پھر جیل کا کیا لطف ہوتا۔ گاندھی جی جیل میں جاتے ہیں، جیل میں پوری طرح ان کی دیکھ بھال ہوتی ہے، ان کی صحت کا خیال رکھا جاتا ہے ان کو وہاں بکری کا دودھ ملتا ہے لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے جیل سے کوئی ڈر نہیں، لیکن میرے بعد کیا ہوگا میری قوم کا کیا ہوگا، اس تصور سے پریشان ہوتا ہوں۔ اس وقت مسلمانوں کی اپر کلاس کی توجہ اس طرف سے ہٹا کر قوم کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ان لوگوں کو تمام عزت اور سرپرستی کے لیے قوم کی طرف دیکھنا چاہیئے اس وجہ سے طبقہ اُمراء کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہوں، اسی لیے میں نے ورکنگ کمیٹی میں امیر لوگ کو رکھا ہوا ہے، ساتھ ہی میں طلبہ کی طرف نگاہیں جمائے ہوتے ہوں وہ مستقبل کے لیڈر ہیں۔ اپر کلاس کے لوگ اپنے آپ کو فطری طور پر رہنما سمجھتے ہیں۔ انگریز جہاں جہاں گئے اُن ممالک میں انہوں نے اوپر والے طبقہ کو اپنی مٹھی میں لیا اور ان کے ذریعہ قوم کو غلام بنایا،

اسی طرح جناح صاحب امیروں کو اپنے ساتھ ملا کر قوم کو غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے؛ اگر وہ اپنے ساتھ اپر کلاس کو لے کر نہیں چلیں گے تو دوسرے لوگ ان کو اپنے ساتھ ملا کر ہمارے موقف کو کمزور کر دیں گے اور تحریک کو نقصان پہنچا دیں گے۔

جناب طوسی صاحب نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اندرونی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ایک دفعہ دہلی میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ تھا اس وقت ممبران میں گرما گرم بحثیں چھڑی ہوئی تھیں، اراکین میں بڑی کشیدگی تھی اور سخت تلخی تھی۔ ایک ڈاکٹر عبدالحمید قاضی صاحب تھے۔ وہ تحریک پیش کرنا چاہتے تھے کہ قائداعظم پاکستان کی تعریف پیش کریں۔ دوسری طرف شیعہ حضرات تھے جن کا موقف یہ تھا کہ اگر پاکستان کو خلفاءِ ثلاثہ کی طرز پر چلانا ہے تو پھر اس کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک قرارداد بھی بھیج دی تھی، میں نے سوچا کہ یہ ایک دلچسپ سیشن ہوگا اس کو دیکھنا چاہیئے لہٰذا میں جلسہ میں چلا گیا۔ جب اجلاس شروع ہوا تو ڈاکٹر عبدالحمید قاضی صاحب نے اپنی قرارداد پیش کرنے کی اجازت چاہی تو قائداعظم نے ان کو اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ بیشتر اس کے کہ معزز رکن اپنی قرارداد کو پیش کریں میں اس مسئلہ پر صورتِ حال کو صاف طور سے واضح کرنا چاہتا ہوں پاکستان کا مطلب انتقالِ اقتدار ہے، انگریزوں کے ہاتھوں سے جب طاقت منتقل ہو کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئے گی تو پاکستان بنے گا۔ ایک دفعہ جب طاقت منتقل ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آجائے گی تو ہم بھائیوں کی طرح مل جل کر بیٹھیں گے اور اپنے اختلافات کو طے کریں گے اور حکومت بنائیں گے لیکن اِس وقت ہماری تمام جدوجہد کا مرکز یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ انگریزوں کو طاقت چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں متحد ہو کر انگریزوں سے محاذ آرائی کرنی ہے۔ حکومت بنانے کا جہاں تک تعلق ہے یہ ہمارا گھریلو مسئلہ ہے۔ ہم اس کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم

اچھے مسلمان ہوں، اس وقت ہماری تمام جدوجہد اس بات پر ہو کہ ہم برطانوی حکومت کو طاقت چھوڑ دینے پر مجبور کر دیں، انہوں نے پھر اس سلسلہ میں مثال بھی دی کہ آپ دیکھیں کہ عراق ہے، جہاں پر شیعہ سنی اکٹھے رہتے ہیں۔

اس طرح جناح صاحب نے اس فتنہ کو اپنے تدبر اور عقل سے ختم کیا۔ آپس میں جو کشیدگی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اسی طرح پیر پگاڑہ کی جائیداد کے بارے میں اراکین کی دو مختلف رائیں تھیں مسلم لیگ کا ایک گروپ اس بات کا حامی تھا کہ یہ جائیداد پیر پگاڑہ کے وارثوں کو دلائی جائے دوسرا گروپ یہ کہتا تھا کہ یہ جائیداد سندھ یونیورسٹی کے لیے حاصل کی جائے اس مسئلہ کو بھی جناح صاحب نے بڑے تدبر سے حل کیا، انہوں نے فرمایا کہ اس وقت ہمارا مقابلہ انگریزوں کے ساتھ ہے، جائیداد جو ضبط کی گئی ہے وہ مسلمان کی جائیداد ہے ہمیں برطانوی حکومت کو اس بات پر مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ اس جائیداد کو مسلمانوں کو واپس کر دے، جب وہ جائیداد واپس آئے گی تو ہم فیصلہ کریں گے کہ وارثوں کو دیں یا یونیورسٹی کو دیں مگر فی الحال ہم سب کو اکٹھا ہو کر انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کرنی چاہیئے۔ طوسی صاحب فرماتے ہیں کہ جناح صاحب کی فراست اور ذہانت کی داد دینی چاہیئے جنہوں نے مسلمانوں کو متحد کر دیا تھا۔

۳ جون ایوارڈ کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے طوسی صاحب نے فرمایا کہ ۹ جون ۱۹۴۷ء کو جو مسلم لیگ کونسل کی میٹنگ دہلی میں منعقد ہوئی اس کی کارروائی میں نے دیکھی تھی۔ میرا خیال یہ ہے کہ لیاقت علی خاں صاحب جناح صاحب کو مجبور کر رہے تھے کہ جو کچھ بھی مل رہا ہے اس کو قبول کر لیا جائے، اس جلسہ میں مسلم لیگ نے تین جون کے ایوارڈ کو منظور کر ہی لیا تھا لیکن اس کو قانونی شکل دینی تھی۔ ۹ جون کے جلسہ میں لیاقت علی خاں صاحب نے پورا اہتمام کیا ہوا تھا کہ کوئی ایسا شخص نہ آئے جو اس ایوارڈ کے خلاف تقریر کرے، بلکہ ہر ایسے شخص کو بلایا جائے جو کہے کہ ہمیں منظور ہے، جو کچھ انگریز دے رہا

ہے ٹھیک ہے، وہاں کسی کو بولنے کی اجازت نہیں تھی لیکن پھر بھی دو تین آدمی آ ہی گئے جنہوں نے ایوارڈ کی مخالفت میں اظہارِ خیال کیا، ان میں ایک سر عبدالرحیم تھے اور ایک زیڈ۔ اے لاری تھے، باقی حضرات نے ایوارڈ کے حق میں تقریریں کیں، پیر صاحب زکوڑی شریف نے بڑی جذباتی تقریر کی تھی، ایسی جذباتی تقریر تھی جو بالکل بے معنی تھی، جو اچھی تقریر تھی وہ زیڈ۔ اے لاری صاحب کی تھی انہوں نے کہا کہ انگریز جو پاکستان پیش کر رہے ہیں وہ معقول پیش کش نہیں ہے، بنگال چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے، تھوڑا سمندر کا حصہ ہے باقی دائیں طرف آسام ہے دارجلنگ کا علاقہ لے کر اس کو کاٹ دیا ہے، مغرب میں بھی یہی حال ہے، پنجاب کی سرحدی لائن بہت بڑی ہے۔ پھر یہ کہ جو متمدن آبادی ہے وہ تو ہندوستان میں رہ گئی، مشرقی پنجاب اور مشرقی بنگال جو ہیں یہاں پر شہری آبادی کم ہے پنجاب میں ۲۵ لاکھ مسلمان شہروں میں بستے ہیں۔ اس کے برعکس صرف یوپی میں ۳۳ لاکھ شہروں میں بستے ہیں، مدراس میں ۲۵ لاکھ شہروں میں مقیم ہیں ۲۵ لاکھ دیہاتوں میں ہیں یہی کیفیت بمبئی کی بھی ہے اس طرح مسلمانوں کی زیادہ متمدن آبادی تو ہندوستان میں رہ جائے گی اور جو پاکستان ہم لے رہے ہیں اس میں دیہاتی آبادی زیادہ ہے اور شہری آبادی کم ہے، پھر انہوں نے یہ بھی دلیل پیش کی جو بڑے بڑے تعلیمی اور ثقافتی مرکز ہیں مسلمانوں کے وہ انڈیا میں رہ جائیں گے، علی گڑھ ہے، عثمانیہ یونیورسٹی ہے، دیوبند ہے، ندوہ ہے، نیز آپ اس بات پر بھی غور کریں کہ تمام مسلمانوں کی تعداد سات کروڑ ہے اس میں سے چالیس فیصد آبادی ہندوستان میں رہ جائے گی اور ساٹھ فیصد پاکستان میں آئیں گے۔ مگر جو آبادی ہندوستان میں رہ جائے گی وہ شہری آبادی ہے ان کے پاس تجارت ہے، تعلیم ہے اور ہنر ہے۔

قائداعظم اور لیاقت علی خاں کے مابین تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا

کہ ایک مرتبہ مس فاطمہ جناح نے بتایا کہ قائد اعظم نے اپنی بیماری کے زمانہ میں فیح اصفہانی کو جو کہ رنگون کے میئر تھے رنگون میں پاکستان کا سفیر مقرر کر دیا تھا مگر ان کی وفات کے بعد لیاقت علی خاں نے سردار اورنگ زیب کو رنگون میں سفیر مقرر کر دیا۔ یہ بات انہوں نے خان عبدالقیوم خاں کی خوشنودی کے لیے کی تھی جو کہ سردار اورنگ زیب سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے تھے، حالانکہ سردار اورنگ زیب کو نہ برما کی زبان آتی تھی اور نہ ان کا برما سے کوئی تعلق تھا، محض قیوم خاں کا راستہ صاف کرنے کے لیے ایسا کیا گیا کیونکہ عبدالقیوم خاں ان کے آدمی تھے۔ اسی طرح انہوں نے ایک اور واقعہ بتایا کہ کچھ مہاجرین غیر مطمئن تھے۔ کراچی میں اپنی شکایات لے کر لیاقت علی خاں کی کوٹھی پر گئے مگر وہاں سے مایوس ہو کر لوٹے اور شور و غل مچاتے ہوئے جلوس کی شکل میں جناح صاحب کی کوٹھی پر آ گئے، جناح صاحب نے ان کے چند مقتدر افراد کو بلایا، ان کی بات تحمل سے سنی وہ مطمئن ہو کر واپس چلے گئے لیکن جناح صاحب کو بڑا افسوس تھا کہ لیاقت علی خاں صاحب ہوشیاری سے ان لوگوں کے مسئلہ کو بھی حل نہ کر سکے۔

مسلم لیگ کے زوال پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے طوسی صاحب نے کہا کہ ایک سبب تو یہ تھا کہ پاکستان کے قیام کے بعد مسلم لیگ کو بطور ایک سیاسی جماعت کے کسی نے پوچھا ہی نہیں، اس کی ممبر شپ نہیں بڑھائی گئی، الیکشن نہیں کرائے گئے ایک ہی آدمی لیگ کا بھی صدر رہے اور پاکستان کا وزیر اعظم بھی۔ بعد میں پھر سروسز کے لوگ داخل ہونے لگے جنہوں نے اس کا جنازہ ہی نکال دیا، میرے خیال میں غلام محمد بڑے سازشی انسان تھے جنہوں نے اپنے اختیارات کو وسیع کرنے کے لیے اسمبلی ہی کو توڑ دیا جو کہ اس کے راستہ میں حائل تھی۔

خواجہ شہاب الدین

جناب خواجہ شہاب الدین کا تعلق بنگال کے نواب خاندان سے تھا۔ بنگال کی سیاست کو تقسیمِ ہند سے قبل اور پاکستان کی سیاست کو قیامِ پاکستان کے بعد سمجھنے کے لیے جناب خواجہ شہاب الدین کی شخصیت اور کردار کا مطالعہ بہت ضروری ہے، ان کی شخصیت کا مطالعہ کیے بغیر پاکستان کی تاریخ کے نشیب و فراز کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ لیاقت علی خاں کے زمانہ میں وہ مرکزی وزیر داخلہ اور اطلاعات تھے، وہ بالعموم طاقت کے مرکز کے قریب رہے ہیں، ان کی روایات اور معلومات ہماری تاریخ کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہے۔ مجھے ان سے بارہا ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے، وہ نہایت بیدار مغز، ہوشیار اور سمجھدار انسان تھے! ان کے میل ملاپ میں ایک خاص شریفانہ وضعداری تھی۔ ان کی وفات ۱۹۷۷ء کو ہوئی تھی۔ ان سے ملاقاتوں کا حال نذرِ قارئین کر رہا ہوں۔ میری ان سے ملاقاتیں کراچی ہی میں ہوئی تھیں۔ دسمبر ۱۹۷۴ء میں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

۹ر جون ۱۹۴۷ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کی کارروائی کا

حال بیان فرماتے ہوئے جناب خواجہ شہاب الدین صاحب نے فرمایا کہ اگر خاکساروں کا حملہ اُس دن امپیریل ہوٹل پر پہلے ہو جاتا تو پھر صورتِ حال کچھ اور ہی ہوتی، صبح کے اجلاس میں تین چار آدمی بولے اور لوگ بھی بولنے کو تیار تھے۔ دو تین آدمیوں نے تقریریں بھی کی تھیں، زیادہ تر حضرات دوسری نشست کا انتظار کر رہے تھے، لیکن جونہی دوپہر کے بعد کی نشست شروع ہوئی ایک دم سے لوگوں کی رائے طلب کی گئی جو کہ تقریباً متفقہ تھی۔ قائداعظم نے اس موقعہ پر بحث کرنے کی اجازت نہیں دی تھی، اس کے فوراً بعد خاکساروں کا حملہ ہوا، اگر حملہ پہلے ہوتا تو فیصلہ رک جاتا۔ یہ بات بہت اہم ہے مگر لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ خاکسار پاکستان کے خلاف تھے اور ہندو یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے اندر ہی سے ایک گروپ کو پاکستان کے خلاف اکسایا جائے، اگر خاکسار کامیاب ہو جاتے تو یہ ہندوؤں کی بڑی کامیابی ہوتی۔ یہ ضرور ہوا ہے کہ صبح کی نشست میں دو چار تقریریں ہوئی تھیں۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ اس موقعہ پر جمال میاں فرنگی محلی نے یہ کہا یہ کیا ہو رہا ہے، آج تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیئے تھی مگر لوگ رنج کا اظہار کر رہے ہیں۔

خواجہ شہاب الدین صاحب نے قائداعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم لوگ جب بڑے آدمیوں کے بارے میں سوچتے ہیں تو ان کو فرشتہ سمجھ کر سوچتے ہیں، ان کو انسان نہیں سمجھتے۔ انسان کا مزاج حالات سے متاثر ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں فکر و عمل کی تبدیلی رونما ہوتی ہے، ہم اس بات کو بڑے آدمیوں کے بارے میں بھلا دیتے ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح شروع زمانہ ہی سے ایک ماڈرن انسان رہے ہیں۔ ان کے خیالات پر جدید عہد کی چھاپ تھی، وہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کر رہے تھے۔ ہمیں اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ ۱۱ اگست کی تقریر سے کچھ لوگ پریشان تھے۔ پھر میں نے خواجہ صاحب سے لیاقت علی خاں کے قتل کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہیں تو وہ بولے کہ ہمارے یہاں جو اخبارات اور رسالے

نکلتے ہیں ان میں تو افسانے ہوتے ہیں۔ ان کا واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے وہ تو ایک قصہ بنا کر بیان کرتے ہیں اور پھر جہاں تک حقائق کا تعلق ہے وہ سامنے نہیں آئیں گے، افسانے آئیں گے، حقائق ہیں بھی کم اور نہیں بھی۔ جناب لیاقت علی خاں کے قتل کے بارے میں جب میں نے ان سے یہ کہا کہ ایک خیال یہ ہے، کہ لیاقت علی خاں کو سید[1] اکبر نے قتل نہیں کیا بلکہ پولیس نے کیا ہے، ان کو گولی پشت سے لگی تھی جو سینہ چیر گئی تھی، آگے سے نہیں لگی تھی، ان کی پشت چھلنی نہیں ہوئی تھی بلکہ سینہ چھلنی ہوا تھا، تو یہ بات سن کر خواجہ صاحب کو ہنسی آگئی فرمانے لگے تو اچھا

---

[1] سرکاری روایت کے مطابق سید اکبر ہی لیاقت علی خاں کا قاتل ہے مگر میری تحقیق یہ ہے کہ سید اکبر کو محض ایک قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے تاکہ تمام سازش چھپی رہے، اگر سید اکبر لیاقت علی خاں کو قتل کرنے کے ارادہ سے آیا تھا تو اس کو پھر اپنے ہمراہ اپنا بچہ ساتھ نہ لانا چاہیئے تھا کیونکہ ایسے ہولناک مشن پر کوئی انسان اپنی اولاد کو خطرے میں نہیں ڈالتا۔ پھر یہ کہ سید اکبر کی لیاقت علی خاں سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی۔ اس کا لیاقت علی خاں سے نہ سماجی رشتہ تھا نہ کوئی علاقائی تعلق تھا لیکن اس کا لیاقت باغ میں ایبٹ آباد سے آجانا ڈرامے کا ایک اہم حصہ ضرور تھا تاکہ لوگوں کی تمام توجہ اس بے گناہ اور لاوارث انسان پر مرکوز رہے اور اصلی قاتل اور حقیقی سازش پر پردہ پڑا رہے۔ سید اکبر افغانستان کے پناہ گزینوں میں سے ایک تھا۔ اس کا بڑا بھائی بھی اس کے ساتھ افغانستان سے ۱۹۴۴ء میں بھاگا تھا۔ ایبٹ آباد میں پناہ گزین ہوا تھا۔ تھانیدار حسین شاہ نے سید اکبر کو لیاقت باغ میں گولی مار دی تھی۔

گجرات شہر کے ایک سید تھے جن کا نام اکرام الرحمٰن بخاری مرحوم تھا وہ تحصیلدار تھے، ان کے حسین شاہ سے سماجی تعلقات تھے حسین شاہ بھی گجرات کا رہنے والا تھا مدینہ کی بستی کا، اکرام الرحمٰن بخاری صاحب نے ایک دن اس تھانیدار سے پوچھا کہ شاہ جی! یہ بتاؤ تم نے سید اکبر کو کیوں گولی ماری تھی؟ اس پر وہ بولا کہ مجھے جوش آگیا تھا، اس پر بخاری صاحب نے اس سے کہا کہ نہ

باقی صفحہ ۱۲۴ پر

اب لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں حالانکہ سید اکبر کے ہاتھ میں پستول تھا، ہزاروں کا مجمع تھا، اب یہ نئی چیز چلی ہے، پھر خواجہ صاحب کو کھانسی آگئی اور انہوں نے خاموشی اختیار فرمائی۔ لیاقت علی کے قتل کے بارے میں میرے اصرار پر انہوں نے فرمایا کہ آپ کی طبیعت

بقیہ حاشیہ از ص ۱۲۳

آپ مہاجر، نہ آپ لیاقت علی خاں کے رشتہ دار تو پھر آپ کو کیوں جوش آگیا تھا؟ اس پر وہ کھسیانا ہو گیا، ان کے اصرار پر اس نے بتایا کہ ہمیں ایک آدمی کو مارنے کا حکم ملا ہوا تھا۔ میں نے بہت سے افراد سے اس جلسہ کا حال معلوم کیا ہے، سب یہ کہتے ہیں کہ لیاقت علی کے قتل کے بعد بہت ہوائی فائرنگ ہوئی تھی، جو کہ پولیس نے کی تھی۔ کم از کم ساٹھ ستر فائر ہوئے تھے، بھگدڑ مچ گئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ پولیس کو فائرنگ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

میرے ایک واقف کار آفیسر تھے جن کا نام اکرم خاں تھا، نہایت صاف گو اور سیدھے سادے انسان تھے اور ہیرا پھیری سے بہت دور تھے۔ ان کا ایک چپراسی تھا جو حلفیہ کہتا تھا کہ وہ اُس دن سید اکبر کے بالکل ساتھ بیٹھا ہوا تھا، سید اکبر نے کچھ بھی نہیں کیا تھا اس کو ویسے ہی مار ڈالا گیا۔

میں نے خود نواب صدیق علی خاں کی تقریر اسلام آباد سنٹر میں سنی تھی جس میں انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ لیاقت علی خاں کا سینہ پھٹا تھا اور یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ گولی پیچھے سے لگی ہو، اگر گولی آگے سے لگتی تو پشت چھلنی ہو جاتی ہے۔ جس اسٹیج پر لیاقت علی خاں کھڑے تھے وہ بالکل ننگی اسٹیج تھی، چاروں طرف سے بالکل کھلی ہوئی تھی، اسٹیج کا اہتمام اس طور سے کیا گیا تھا کہ قاتل کو کوئی کسی قسم کی پریشانی نہ ہو، اس کا نشانہ بالکل خطا نہ ہو۔ لیاقت علی خاں کے پاس خطوط بھیجے گئے کہ ہم آپ کو اسٹیج پر اچھی طرح دیکھنا چاہتے ہیں، کوئی ہمارے اور آپ کے مابین رکاوٹ نہ ہو وغیرہ۔

نواب صدیق علی خاں، وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے پولیٹیکل سیکرٹری تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "بے تیغ سپاہی" میں اس افسوس ناک واقعہ کی تفصیل بیان کی ہے، مگر یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے۔ تاریخ کے طالب علم اس طرف خصوصی توجہ مبذول کریں۔ ایم۔ بی۔ احمد صاحب نے مجھے ایک

باقی صفحہ ۱۲۵ پر

کی تشفی کے لیے بتاؤں کہ ان کو گورمانی اور غلام محمد نے مروایا اسی لیے وہ دونوں وہاں (راولپنڈی میں) موجود تھے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ آپ جب یہاں

بقیہ حاشیہ از صفحہ ۱۲۴

بڑی حیران کن بات بتائی۔ احمد صاحب کیبنٹ سیکرٹری تھے اور قیام پاکستان سے قبل جج بھی رہے تھے۔ احمد صاحب نے فرمایا:۔

کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ان کی بیگم صاحبہ ہندوستان سے پاکستان تشریف لا رہی تھیں، وہ ان کو لینے کے لیے لاہور ریلوے سٹیشن پر گئے۔ ان کی بیگم صاحبہ بذریعہ ریل گاڑی تشریف لا رہی تھیں، جب وہ ان سے ملیں تو انہوں نے احمد صاحب سے پوچھا کہ کیا لیاقت علی خاں قتل ہو گئے؟ اس پر وہ حیران ہوئے کہا یہ کیا کہہ رہی ہو وہ بولیں کہ انہوں نے یہ بات ہندوستان میں سنی ہے چلتے ہوئے۔ جبکہ لیاقت علی خاں ۱۶ اکتوبر کو قتل ہوئے۔

چودھری ظفر اللہ خاں صاحب کا یہ کہنا تھا کہ وہ اس سازش میں شریک نہیں تھے، بقول احمد یار خاں صاحب کے یہ ایک گہری سازش تھی۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ اندرونی اور بیرونی سطح پر نہایت ہی گھناؤنی سازش تھی جو لیاقت علی خاں کے خلاف کم اور پاکستان کے خلاف زیادہ تھی۔ اس دن سے آج تک ہم سنبھلے نہیں، صدر کینیڈی کے قتل اور لیاقت علی خاں کے قتل کے واقعات میں بڑی مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے جو بڑے تعجب کی بات ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دونوں جگہ ایک ہی دماغ کام کر رہا تھا۔ جناب اعتزاز صاحب جو کہ اس قتل کی تحقیقات میں سرگرم عمل تھے اور جنہوں نے ہوائی جہاز میں سوار ہونے سے قبل یہ فرمایا تھا کہ انہیں بہت اہم معلومات حاصل ہو چکی ہیں ان کا ہوائی جہاز فضا میں جل کر خاک ہو گیا، اس طرح وہ تمام ریکارڈ بھی ضائع ہو گیا جو کچھ انہوں نے اکٹھا کیا تھا۔ اس سلسلہ میں حال ہی میں ایک کتاب منظر عام پر آئی ہے جس کا نام ہے AMERICAN ROLE IN PAKISTAN POLITICS اس کو پڑھ کر بہت سے شکوک و شبہات صاف ہو جاتے ہیں۔

تک پہنچ گئے تو ذرا اور کوشش کریں یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہوگا۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد وزارتِ عظمٰی کے عہدے کا فیصلہ کس طرح ہوا خواجہ شہاب الدین نے فرمایا، اس دن سوائے چودھری ظفر اللہ خاں کے سب موجود تھے، چودھری ظفر اللہ خاں کا تار آگیا تھا، یہ واقعہ ہے تقریباً چار بجے بعد دوپہر کا، مجھے فون آیا کہ ایسا واقعہ ہوگیا ہے، میں فوراً کیبنٹ روم میں پہنچ گیا وہاں پرائیس۔ ایم اکرام صاحب بھی موجود تھے، سردار بہادر صاحب بھی تھے، تقریباً سب ہی وزراء وہاں پر موجود تھے، واقعات سن رہے تھے اور رو رہے تھے، یہ واقعہ کچھ ایسا تھا کہ عقل کام نہیں کر رہی تھی، بعض حضرات کا خیال تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی سازش ہے کوئی بغاوت رونما ہونے والی ہے تو اس لیے یہ ازحد ضروری ہے کہ جلد از جلد کوئی فیصلہ ہو جائے۔ اس وقت سردار بہادر اور فضل الرحمٰن وغیرہ نے کہا خواجہ ناظم الدین صاحب کو وزیراعظم ہو جانا چاہیئے۔ میں نے اس خیال کی مخالفت کی ان لوگوں کو تعجب ہوا۔ اصولاً میں نے جو بات کی تھی وہ یہ کہ پاکستان میں صوبہ پنجاب کی بڑی اہمیت ہے اور جب تک وہ اس فیصلہ میں شامل نہ ہو اس وقت تک بات ملتوی رکھی جائے کیونکہ میں یہ جان رہا تھا کہ ہمارے یہاں جس قسم کی سازشیں وغیرہ ہوتی ہیں ان سے بھائی مرحوم جیسا سیدھا سادا اور ایمان دار انسان نہیں نبٹ سکتا، اس وجہ سے اس وقت میں اس تجویز کی مخالفت کر رہا تھا، حالانکہ اس وقت لوگوں نے اس قدر گھیرا ہوا تھا جس کا کوئی جواب نہیں۔ میری مخالفت کی وجہ سے وہ مجلس منتشر ہوگئی۔

غلام محمد اور گورمانی اس وقت پنڈی میں موجود تھے، اس وجہ سے اس مجلس میں کسی کو ان کا سوجھا بھی نہیں۔ لوگوں نے کہا کہ فضل الرحمٰن کے یہاں پھر اکٹھے ہوتے ہیں، اس وقت ڈاکٹر محمود حسین بھی تھے اور ڈاکٹر اشتیاق بھی۔ جب ہم پھر

اکٹھے ہوئے تو سب سے پہلے یہ بات ہوئی کہ بیگم لیاقت علی خاں کو کون خبر کرے، بالآخر فیصلہ ہُوا کہ چودھری محمد علی کو بھیجا جائے۔ پھر ہم فضل الرحمٰن کے یہاں گئے، وہاں لوگوں نے پھر زور دیا، میں نے کہا کہ نہیں میں اس تجویز کی مخالفت کروں گا اور یہ کہہ کر ہم گھر چلے آئے۔ اس زمانہ میں مجھے سر درد کی شکایت تھی، گھر میں کھانا بھی نہیں کھایا تھا رات کو ساڑھے نو بجے کے قریب الطاف حسین کا ٹیلیفون آیا وہ فضل الرحمٰن کے یہاں سے بات کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ یہاں تشریف لے آئیں تو ہم لوگ بات کر لیتے ہیں، وہ ہمیں منانا چاہتے تھے، میں نے انکار کیا اور کہا کہ میرے سر میں درد ہے، اگر آپ کا دل چاہے تو آپ تشریف لے آئیں، لہٰذا وہ چلے آئے۔ پھر یہی باتیں ہونے لگیں، میں نے پھر اس تجویز کی مخالفت کی، انہوں نے (الطاف حسین) پنجاب کا قصہ بیان کیا بلکہ آخر میں لوگ الطاف کو برا بھلا بھی کہنے لگے تھے کیونکہ اس کی زبان سے غلام محمد کا نام نکل گیا۔ ہم نے کہا کہ ان کی حالت تو ایسی ہے کہ وہ ٹھیک طرح بات بھی نہیں کر سکتے، لیکن جواباً کہا گیا کہ یہ عہدہ تو صرف رسمی عہدہ ہے، اس پر میں نے کہا اچھا میں مخالفت سے باز آتا ہوں کیونکہ اس طرح پنجاب کی نمائندگی ہو جاتی ہے، اس وقت تو نظر خواہ مخواہ کے لیے کابینہ کے اندر ہی پڑتی تھی اور اُس عہدے کے لیے اس سے قبل جو امیدوار تھے وہ عبدالرب نشتر تھے اوّل تو وہ ہو نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کا تعلق پنجاب سے نہ تھا، دوسری بات یہ تھی کہ صوبہ سرحد میں قیوم خاں بڑے اہم تھے۔ اگر نشتر ہو جاتے تو اس طرح قیوم[1] اور نشتر[2] کے تعلقات مرکز کو بڑا متاثر کرتے کیونکہ ان دونوں حضرات کے مابین تعلقات کوئی خوش گوار نہ تھے حالانکہ اس سے قبل جو گفت گو ہوتی رہی اس میں چودھری محمد علی صاحب یہ اشارے کرتے رہے کہ لیاقت علی خاں صاحب کا خیال نشتر ہی کی طرف تھا،

---

[1] خان عبدالقیوم خاں [2] سردار عبدالرب نشتر

آخری زمانہ میں لیاقت علی خاں کا یہ خیال ہو رہا تھا کہ نشتر ان کی جگہ لے لیں گے۔ حالانکہ لیاقت علی خاں، بھائی (خواجہ ناظم الدین) سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھتے تھے ان سے گفتگو میں برابر یہی کہتے رہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب معاملات میں شریک رہیں، خدانخواستہ اگر ہم کو کچھ ہوجائے تو آپ کا ایک آدمی جگہ لے سکے، یہ بات برابر وہ کہہ رہے تھے۔ غرضیکہ اس میٹنگ میں جب الطاف صاحب نے غلام محمد کا نام لیا تو میں نے کہا کہ پھر میں اپنا اعتراض واپس لیتا ہوں کیونکہ اس طرح پنجاب کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ الطاف میرے پاس سے اٹھ کر فضل الرحمٰن کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ ہم شہاب الدین کو راضی کر آئے۔ خواجہ ناظم الدین صاحب کو صبح کراچی پہنچنا تھا فضل الرحمٰن کا فون آیا کہ پیشتر اس کے کوئی اور خواجہ صاحب کو متاثر کرے ہم سویرے ماری پور کے ہوائی اڈے پر ان سے ملیں ہو سکتا ہے کہ چودھری محمد علیؒ ان کے خیالات پر اثر انداز ہو جائیں۔ لہذا صبح کو ہم لوگ ایک ساتھ ہی گئے مگر ہمارے پہنچنے میں تاخیر ہو گئی، ادھر جہاز قبل از وقت آگیا۔ بھائی سے موقعہ ہی نہیں مل سکا، ہم لوگ واپس چلے آئے، رات کو پھر ملاقات ہوئی۔

ہمیں یہ نوٹس ملا کہ بھائی نے کابینہ کا اجلاس طلب کیا ہے وہاں پر فیصلہ ہوگا، ہم نو بجے وہاں گئے۔ غلام محمد، گورمانی اور ظفر اللہ خاں غیر حاضر تھے، بھائی ایک ایک کرکے آدمی کو بلانے لگے، تقریباً ہم کو آخر میں بلایا۔ ہم جب گئے وہ کپڑے بدل رہے تھے، مجھ سے پوچھا تو میں نے وہ تمام باتیں اُن کو بتا دیں جو کچھ کل ہوئی تھیں، میں

لہ چودھری محمد علیؒ سے میری ملاقاتیں کئی دفعہ ہوئی ہیں، میں نے چودھری صاحب سے اس سلسلہ میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا تھا کہ وہ ہوائی جہاز میں خواجہ صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تھے اور انہوں نے ہی مشورہ دیا تھا کہ خواجہ صاحب وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ قبول فرمالیں اور غلام محمد کو گورنر جنرل ہونے دیں۔

نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح میں نے مخالفت کی، ان لوگوں نے ایسا کیا، پھر الطاف کے خیال سے بھی آگاہ کیا، اس پر میں نے کہا کہ اگر یہ ہو سکے تو میں راضی ہوں، یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ کابینہ نے یہ فیصلہ کیا کہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم ہو جائیں اور غلام محمد گورنر جنرل ہو جائیں۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ لیاقت علی خاں اپنے قتل سے پہلے بڑی اہم تبدیلیاں کرنے والے تھے، اس سلسلہ میں کئی وزیروں کو ہٹانے کا ارادہ کر رہے تھے، ان وزرا میں آپ کا بھی نام لیا جاتا ہے اور غلام محمد کا بھی۔ خواجہ شہاب الدین صاحب نے فرمایا کہ تبدیلیوں کی بات بہت پہلے سے ہو رہی تھی، ظفر اللہ خاں چار ماہ قبل سے آگاہ تھے۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا لیاقت علی خاں کے قتل میں کسی غیر ملک کا ہاتھ تھا خواجہ صاحب نے فرمایا کہا نہیں جا سکتا میں تو وزیر داخلہ تھا تمام کاغذات میرے پاس آئے تھے مگر مجھے کوئی سراغ نہ مل سکا، سید اکبر ایک مذہبی جنونی تھا، ہمارے یہاں تو یہ دستور ہے کہ قیاس پر ایک پورا کیس بنا لیتے ہیں اور قیاس کو یقین کا درجہ دے دیتے ہیں، اس زمانہ کا جو وزارتِ داخلہ کا سیکرٹری تھا وہ لیاقت کا بے انتہا وفادار شخص تھا، میں بالکل اندر کے معاملات جانتا تھا مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ غلام محمد نکل رہے تھے، ان کی صحت کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ ان کو یہ عہدہ بھی مل سکتا ہے، ان کا تو سوال اٹھتا ہی نہیں تھا وہ تو الطاف کے منہ سے بات نکل گئی اس پر ہم نے ہاں کر لی۔ رات کو فیصلہ ہوا تھا کہ عبدالرب نشتر وزیر اعظم ہوں گے پھر بعد میں یہ فیصلہ ہوا، جہاں تک نشتر صاحب کا تعلق ہے اس کو تو بری طرح سے مسترد کر دیا گیا تھا۔

خواجہ شہاب الدین صاحب نے مسلم لیگ کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ مسلم لیگ کیا تھی؟ قائد اعظم تھے مسلم لیگ اس کے بعد کابینہ تھی مسلم لیگ، دیکھئے لوگ مسلم لیگ مسلم لیگ کرتے ہیں مگر اس وقت مسلم لیگ قائد اعظم تھے اور صوبوں میں جو لوگ

کام کرتے تھے ان کے فیصلے لیگ کو ماننے پڑتے تھے، کبھی بھی لیگ کے فیصلوں کی پیروی حکومت نے نہیں کی۔

خان لیاقت علی خاں کے دورۂ امریکہ پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب شہاب الدین صاحب نے فرمایا کہ امریکہ سے قبل روس نے لیاقت علی خاں کو دورہ کی دعوت دی تھی اور بات یہاں تک ہو چکی تھی کہ انہوں (روسیوں) نے لیاقت علی خاں کی شرائط بھی قبول کر لی تھیں۔

لیاقت علی خاں نے شرط لگائی تھی کہ روس کی تمام کابینہ میری اسی طرح سے پیشوائی کرے جس طرح پنڈت نہرو کی کی تھی روسیوں نے یہ شرط بھی مان لی، فہرست بھی تیار ہو گئی تھی۔ لیکن امریکہ جا کر سیاست کا تمام رخ ہی بدل گیا اور اس تبدیلی میں چودھری محمد علی کا ہاتھ تھا چودھری محمد علی مشیر تھے، لیاقت علی خاں پر وہ چھائے ہوئے تھے۔ جب تک وہ نہ آتے اس وقت تک کابینہ کی میٹنگ شروع نہیں ہوتی تھی، ہم کو بیٹھنا پڑتا تھا، چودھری صاحب چھائے ہوئے تھے وہ بہت چالاک آدمی تھے، لیاقت علی روس کا دعوت نامہ قبول کر کے امریکہ چلے گئے اور وہاں جا کر کھلم کھلا روس پر حملے کیے، ان کی تمام سیاسی زندگی میں ہم کو ان کا یہ حصہ اتنا خراب معلوم ہوتا ہے، اتنا داغدار ہے کہ کوئی حد نہیں، برخلاف اس کے نہرو نے غیر جانب داری برتی، اس وجہ سے آپ کی تمام سیاست متاثر ہوئی۔

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی پر روشنی ڈالتے ہوئے خواجہ شہاب الدین نے فرمایا غلام محمد نے بھائی کو برطرف کرنے سے پہلے چودھری ظفر اللہ خاں کے ذریعے اور ہائی کمشنر کی وساطت سے اپنی راہیں ہموار کر لی تھیں۔ غلام محمد نے امریکہ سے تعلقات اتنے استوار کر لیے تھے جتنی ان کو ضرورت تھی۔ خواجہ صاحب کہنے لگے کہ میں فرنٹیر سے اتفاقاً کراچی آیا۔ گورنر جنرل[1] کے یہاں ٹھہرا۔ گورنر جنرل کے یہاں دوپہر کا کھانا تھا، ایوب خاں بھی مدعو تھے، دوپہر

---

[1] غلام محمد

کے کھانے کے بعد غلام محمد نے کسی ترکیب سے مجھے رخصت کر دیا۔ مجھے شبہ ہو گیا۔ میں نے بھائی (خواجہ ناظم الدین) سے آکر سب کچھ بتایا اور اس خدشہ کا اظہار کیا کہ مجھے شبہ ہے کہ اندرونِ خانہ کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے تین مرتبہ بھائی کو خطرات سے آگاہ کیا، لیکن سکندر مرزا نے انہیں یقین دلایا کہ "ایوب ساتھ ہے کسی بات کا غم نہ کریں۔" کئی بار انہوں نے یقین دلایا۔ دو سوال بڑے اہم تھے ایک پنجاب کا سوال اور ایک شیعوں کا سوال، اس وقت علماء کمیٹی تشکیل ہو چکی تھی جس نے فیصلہ کرنا تھا کہ یہ ملک اسلامی ہو گا یا نہیں، شیعوں کو خطرہ تھا کہ اگر اس کمیٹی کی سفارشات منظور ہو گئیں تو ہمارا تعزیہ وغیرہ بند کرا دیں گے اس طرح شیعہ اور پنجاب بھائی کے خلاف چلے گئے، میں سکندر مرزا کی بہت سی چیزوں کو معاف کر سکتا ہوں مگر اس بات کو نہ معاف کروں گا، یہ باتیں مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئیں۔

جہاں تک غلام محمد کا تعلق ہے، لوگوں نے بھائی سے کہا کہ آپ کے اختیارات ہونے چاہئیں، غلام محمد سے اختیارات لے لیے جائیں۔ مگر غلام محمد جونہی گورنر جنرل بنے انہوں نے احسان فراموشی کی، غلام محمد نے خود ہم سے کہا کہ آپ لوگوں نے جو ہمارے لیے کیا، اگر ہم اپنے چمڑے کی جوتی بھی بنا کر دیں تو آپ کا احسان ادا نہیں ہو سکتا، بھائی کے ہٹانے میں چودھری محمد علی کا بھی ہاتھ تھا، بھائی احمدی تحریک کی وجہ سے ظفر اللہ خاں سے ناراض تھے۔ اس سازش میں اسکندر مرزا، غلام محمد، چودھری محمد علی گورمانی، جی احمد اور عزیز احمد کے بھائی شریک تھے، بھائی نے دو ایک موقعوں پر جی احمد کو ہٹانا بھی چاہا، اس کو اس کی حیثیت کے مطابق رکھنا چاہتے تھے، اس کی وجہ سے وہ ناراض ہو گیا۔

ایوب خاں صاحب کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ایوب خاں نے اقتدار پر قبضہ جمانے کے لیے بڑی خوبصورتی سے منصوبہ بندی

کی ہوئی تھی، انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کھلم کھلا غلام محمد ہی کے زمانہ میں کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں ایبٹ آباد میں تھا اور لیاقت علی خاں کی برسی کا موقعہ تھا۔ اس زمانہ میں غلام محمد بھی وہاں آ گئے، ہمارے یہاں برسی کی مجلس میں قرآن خوانی ہوئی، پھر ایوب خاں صاحب نے خطاب کرنا تھا۔ ایوب خاں نے اپنی تقریر کے دوران میں جمال عبدالناصر کے حوالے دیے جس سے ان کے ذہن کا پتہ چل رہا تھا۔

تیسری دنیا میں حکومتوں کی الٹ پلٹ کے بارے میں بیان کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے فرمایا کہ یہ تو بہت شروع کی بات ہے جب لیاقت علی خاں انگلستان تشریف لے گئے تو برطانیہ کے وزیر اعظم جناب ایڈن (EDEN) نے کہا تھا کہ یہ تو ہمارے اختیار میں ہے کہ جس وقت کہو، مشرق وسطیٰ میں، ایشیا میں، جہاں کہو وہاں کا تختہ الٹ دیں اور حکومت کو بدلوا دیں اس وقت سیاست یہی تھی آج برطانیہ کی جگہ امریکہ ہے وہ کیا کر رہا ہے، بدقسمتی سے ہمارے یہاں جمہوریت یا پارٹی سسٹم جڑ نہیں پکڑ سکا جو طاقت کی کرسی پر بیٹھا ہوتا ہے اس کی ہاں میں سب ہاں ملاتے ہیں، فوج نے جہاں حمایت کا وعدہ کر لیا کافی ہے۔ یہ جو باتیں کرتے ہیں لوگ عوام عوام کی آجکل کی بات ہے۔

چودھری محمد علی کے بارے میں خواجہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے زور دے کر ان کو وزیر خزانہ بنوایا، یہ بلاشبہ میری ذمہ داری تھی، ان کو قائداعظم کے ساتھ کم دیکھا، البتہ وہ لیاقت علی خاں پر چھائے ہوئے تھے، مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں چودھری محمد علی کا بڑا ہاتھ ہے۔

میاں ممتاز دولتانہ صاحب کے بارے میں خواجہ صاحب نے فرمایا کہ انہوں نے بھی اپنے آپ کو برباد کیا، بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہیں قدرت نے تعلیم سے، پیسہ سے نوازا اور کم عمری میں وہ بلندی پر آ گئے مگر اپنے ہی کرتوتوں سے برباد ہوئے۔ قربان علی خاں کے بارے میں خواجہ صاحب نے فرمایا کہ قربان علی کو تو ہم لوگوں نے بنایا تھا، بھائی

نے بنایا تھا۔ پاکستان پہ لکھی جانے والی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب بولے کہ ہمارے یہاں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں "میں" "ہی" "میں" ہوتی ہے جیسے چودھری خلیق الزمان کی کتاب، اس میں بے انتہا عیب ہیں، کام کی بھی باتیں ہیں، چودھری محمد علی کی کتاب بڑی اچھی ہے۔ ہمارے یہاں روایات نے، ترجمہ اور تاویلات نے اسلام کو مسخ کر دیا۔

مولانا جمال میاں فرنگی محلی، کراچی

جناب مولانا جمال میاں فرنگی محلی آل انڈیا مسلم لیگ کے جائنٹ سیکریٹری تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن تھے اور یو پی لیجسلیٹو اسمبلی کے بھی رکن تھے۔ قبلہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے صاحب زادے ہیں، جنہوں نے خلافت تحریک میں مسلمانانِ ہند کی ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس گھرانے کی دینی، علمی اور سیاسی خدمات مسلمانانِ ہند کی تاریخ کا شاندار باب ہے۔ مولانا جمال صاحب نے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت اور رفاقت میں برسوں کام کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ آپ تحریکِ آزادی کی چند باقی ماندہ شخصیتوں میں سے ایک ہیں آپ کی فراہم کردہ معلومات ہماری قومی تاریخ کا بڑا قیمتی اثاثہ ہیں۔ آپ نہایت صاف گو، مخلص، بیباک اور نڈر انسان ہیں۔ آپ نے کلمہء حق کہنے میں کبھی بھی جھجک محسوس نہیں کی۔ ۱۹۸۴ء میں کراچی میں مولانا صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی جس کا حال مختصراً تحریر کر رہا ہوں۔

قبل از پاکستان مسلمانوں کی صورتِ حال اور تحریکِ پاکستان کے نشیب و فراز پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے فرمایا کہ اس وقت

مسلمان پورے ہندوستان میں دس کروڑ تھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ بعض علاقوں میں ان کی اکثریت تھی اور بعض علاقوں میں اقلیت میں تھے، سوال یہ تھا کہ ان مسلمانوں کو اکثریت کے غلبہ سے کیسے بچایا جاتے ؟ کوئی ایسی راہ تلاش کی جاتے جس میں دونوں قومیں امن وامان اور پیار و محبت سے رہ سکیں، اس کے لیے یہی سوچا گیا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ہندو اس جگہ اقلیت میں ہیں ہم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے اُس کے بدلے میں وہ اپنے علاقہ میں مسلمانوں سے ایسا ہی برتاؤ کریں گے۔ اس طرح ایک توازن قائم ہو جائے گا اور یہ خیال بھی نہیں تھا کہ انگریز اتنی جلدی رُوانہ ہو جائیں گے بعد میں مسلمان اتنی جلدی متفرق بھی ہو جائیں گے[1] اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس وقت ان کے پاس اتنا بھی اثاثہ نہیں تھا کہ ایک ریاست بھی بنا سکیں بنگال میں صرف دو بنگالی آئی۔ سی ایس آفیسرز تھے۔ پاکستان بناتے وقت ہمارا یہ خیال تھا کہ پاکستان ہماری ابتدا ہوگی یعنی برِصغیر میں مسلمانوں کی طاقت کی بنیاد پڑ جائے گی اور اس کے بعد ہم مزید حقوق حاصل کریں گے، اپنے آپ کو مستحکم کر سکیں گے بد قسمتی سے اسباب جو بھی ہوں، ہُوا اس کے برعکس کہ یہ ہماری انتہا بن گئی اور جو کچھ ہمیں ملا تھا وہ بھی رفتہ رفتہ جا رہا ہے۔ اس وقت ہم یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد ہم اتنی طاقت میں ہوں گے کہ اپنی اقلیتوں کی حفاظت کر سکیں گے۔ یہ خیال ہرگز نہیں تھا کہ ہندو پاکستان سے چلے جائیں گے اور مسلمان ہندوستان سے ہجرت کریں گے۔

۹ جون ۱۹۴۷ء کے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کی کاروائی پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے فرمایا:

کہ حقیقتاً شملہ کانفرنس کے بعد مسلم لیگ کی قیادت بالکل جناح صاحب کے

---

[1] ۱۹۷۱ء سقوطِ ڈھاکہ کی طرف اشارہ ہے۔

مولانا جمال میاں فرنگی محلی، کراچی

جناب مولانا جمال میاں فرنگی محلی آل انڈیا مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن تھے اور یو پی لیجسلیٹو اسمبلی کے بھی رکن تھے۔ قبلہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے صاحب زادے ہیں، جنھوں نے خلافت تحریک میں مسلمانانِ ہند کی ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دی تھیں۔ اس گھرانے کی دینی، علمی اور سیاسی خدمات مسلمانانِ ہند کی تاریخ کا شاندار باب ہے۔ مولانا جمال صاحب نے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت اور رفاقت میں برسوں کام کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ آپ تحریکِ آزادی کی چند باقی ماندہ شخصیتوں میں سے ایک ہیں آپ کی فراہم کردہ معلومات ہماری قومی تاریخ کا بڑا قیمتی اثاثہ ہیں۔ آپ نہایت صاف گو، مخلص، بیباک اور نڈر انسان ہیں۔ آپ نے کلمۂ حق کہنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کی۔ ۱۹۷۰ء میں کراچی میں مولانا صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی جس کا حال مختصراً تحریر کر رہا ہوں۔

قبل از پاکستان مسلمانوں کی صورتِ حال اور تحریکِ پاکستان کے نشیب و فراز پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے فرمایا کہ اس وقت

مسلمان پورے ہندوستان میں دس کروڑ تھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ بعض علاقوں میں ان کی اکثریت تھی اور بعض علاقوں میں اقلیت میں تھے، سوال یہ تھا کہ ان مسلمانوں کو اکثریت کے غلبہ سے کیسے بچایا جائے؟ کوئی ایسی راہ تلاش کی جائے جس میں دونوں قومیں امن واماں اور پیار و محبت سے رہ سکیں، اس کے لیے یہی سوچا گیا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ہندو اس جگہ اقلیت میں ہیں ہم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے اُس کے بدلے میں وہ اپنے علاقہ میں مسلمانوں سے ایسا ہی برتاؤ کریں گے۔ اس طرح ایک توازن قائم ہو جائے گا اور یہ خیال بھی نہیں تھا کہ انگریز اتنی جلدی رُوانہ ہو جائیں گے بعد میں مسلمان اتنی جلدی متفرق بھی[1] ہو جائیں گے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس وقت ان کے پاس اتنا بھی اثاثہ نہیں تھا کہ ایک ریاست بھی بنا سکیں۔ بنگال میں صرف دو بنگالی آئی۔ سی ایس آفیسرز تھے۔ پاکستان بناتے وقت ہمارا یہ خیال تھا کہ پاکستان ہماری ابتدا ہو گی یعنی برصغیر میں مسلمانوں کی طاقت کی بنیاد پڑ جائے گی اور اس کے بعد ہم مزید حقوق حاصل کریں گے، اپنے آپ کو مستحکم کر سکیں گے۔ بدقسمتی سے اسباب جو بھی ہوں، ہُوا اس کے برعکس کہ یہ ہماری انتہا بن گئی اور جو کچھ ہمیں ملا تھا وہ بھی رفتہ رفتہ جارہا ہے۔ اس وقت ہم یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد ہم اتنی طاقت میں ہوں گے کہ اپنی اقلیتوں کی حفاظت کر سکیں گے۔ یہ خیال ہرگز نہیں تھا کہ ہندو پاکستان سے چلے جائیں گے اور مسلمان ہندوستان سے ہجرت کریں گے۔

۹ جون ۱۹۴۷ء کے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کی کارروائی پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے فرمایا:

کہ حقیقتاً شملہ کانفرنس کے بعد مسلم لیگ کی قیادت بالکل جناح صاحب کے

---

[1] ۱۹۷۱ء سقوطِ ڈھاکہ کی طرف اشارہ ہے۔

ہاتھ میں چلی گئی تھی، لوگوں کو ان کی ذات میں اتنا اعتماد ہو گیا تھا کہ ان کے فیصلے جو بھی تھے
ان کو کوئی کونسل کوئی ورکنگ کمیٹی رد نہیں کر سکتی تھی ان پر بحث مباحثہ ہو سکتا تھا
لوگ اعتراض کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ لوگوں کے حقوق لے لیے گئے تھے، اس
وقت اُن کی شخصیت ایسی ہو گئی تھی اگر وہ کوئی چیز منظور کر لیتے تو وہ منظور ہو جاتی تھی۔
دراصل ۳ جون کا پلان وہ منظور کر چکے تھے، اعلان ہو چکا تھا اب یہ اجلاس منظوری
کی تصدیق کرانے کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ اُس وقت اگر اس پلان کی مخالفت کی جاتی
تو اس کے معنی جناح صاحب کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ دینا تھا۔ مگر جناح صاحب
چونکہ منظوری دے چکے تھے لہٰذا اراکین نے اس کو منظور کر لیا لیکن پھر بھی چار پانچ حضرات
نے اس کے خلاف اظہار خیال کیا ان میں ایک زیڈ۔ اے لاری تھے، ہم لوگوں کو معلوم
ہو گیا تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کانگرس والوں کو بُلا کر یہ کہا ہے کہ آپ لوگوں نے
اگر اس پلان کو قبول کرنے میں تامل سے کام لیا تو وہ صوبوں کو اختیارات منتقل کر کے چلے
جائیں گے۔ صوبوں کو اختیارات منتقل کرنے کے معنی تھے کہ بنگال میں حسین شہید سہروردی
اور پنجاب میں یونینسٹ حکومت کو اختیارات مل جائیں گے جو کانگریس کے مفادات پر
بڑی ضرب کاری ہوتی۔ اس طرح ماؤنٹ بیٹن نے پنڈت جواہر لال نہرو کے غبارے
کی ہوا نکالی اور ان کو اس پیش کش سے ڈرایا۔ اسی طرح ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب
کو ڈرایا کہ اگر آپ اس پلان کو (۳ جون کے پلان) نہیں منظور کرتے تو پھر ہم اختیارات
عارضی مرکزی حکومت کو منتقل کر دیں گے اس کا مطلب پنڈت نہرو کی کابینہ کو اقتدار
منتقل کرنا تھا۔ جناح صاحب خود یہ سمجھتے تھے کہ یہ تقسیم سراسر ناانصافی کے ساتھ
ہو رہی ہے مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر اس کو قبول نہ کیا تو پھر بعد میں اتنا بھی نہ حاصل
کر سکیں گے۔ لہٰذا اس پیش کش کو قبول کرنا ہی بہتر ہے۔

۱۴ / ۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے آخری تاریخی اجلاس کی کاروائی

پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا جمال میاں صاحب نے فرمایا کہ وہ خود اس اجلاس میں شریک تھے۔ یہ جلسہ دو دن چلتا رہا، دو دنوں کی تقریروں میں انہوں نے خود حصہ لیا چونکہ ان کی تقریر تنقیدی تھی لوگوں نے بڑی تعریف کی اور حکومت پر آوازیں بھی کسی گئیں "شرم، شرم" کے نعرے بھی بلند ہوئے، لوگوں میں بڑا جوش و خروش تھا اور جس طرح حکومت چل رہی تھی وہ قابلِ تعریف طریقہ نہیں تھا۔ اس دن قائداعظم نے بڑی لمبی تقریر کی تھی اس کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں نے ایک قرارداد پیش کی۔ اس قرارداد میں پاکستان کے بارے میں ایک جملہ تھا "سب سے بڑی مسلمانوں کی حکومت" اس جملہ پر میں نے اعتراض کیا اور کہا کہ آپ اس قرارداد میں سے یہ جملہ ختم کر دیں مجھے اس جملہ پر اعتراض ہے آپ اپنے آپ کو سب کچھ کہہ لیں مگر یہ نہ کہیں۔ چونکہ قرارداد بہت طویل تھی اس کی کاپی میرے ہاتھ میں تھی، قرارداد میں یہ ترمیم پیش کی کہ مسلم سٹیٹ کے الفاظ حذف کر دیے جائیں۔ جمال میاں صاحب نے فرمایا کہ جب میرا نام تقریر کے لیے پکارا گیا میں اسٹیج پر گیا اور تقریر کی۔ جمال صاحب نے کہا دیکھئے ماضی میں بہت سی حکومتیں بنیں اور اسلام کا نام لیا گیا اور انہوں نے بڑی غلط باتیں کیں، اب آپ اس میں نئے باب کا اضافہ نہ کیجیئے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو نیشنل کہیں یا کچھ اور نام لیں اسلامک اسٹیٹ نہ کہیں کیونکہ اس کی ذمہ داریاں بہت ہوتی ہیں اور یہاں پر ہمارے وزراء وغیرہ بیٹھے ہیں یہ حضرات اس طرح عمل نہیں کر رہے ہیں جیسا کرنا چاہیئے میں وزراء کے گھروں میں گیا ان کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر میں حیران رہ گیا، ان کے گھروں میں میں نے تاجروں کو کھڑے دیکھا، سرکاری افسران کو بیٹھے دیکھا، لیکن کسی غریب کو، کسی لاوارث کو، کسی حاجت مند کو، کسی مسکین کو نہیں دیکھا جو اپنی مصیبتوں اور دکھوں کے علاج کے لیے ان وزراء کے گھر پر آیا ہو، تو ایسی حکومت کو مسلم ریاست کہنا لوگوں کے جذبات سے کھیلنا ہے۔ پاکستان کو اگر آپ مذہبی ریاست بنائیں گے تو یہ بات

بڑے فتنوں کا باعث بنے گی، اس سے مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوگا۔ اسلام کا لفظ استعمال کر کے آپ لوگوں کی توقعات کو بہت اونچا کرتے ہیں مگر آپ میں ان توقعات کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں لہٰذا آپ اس بات کو چھوڑ دیں۔ جناح صاحب نے اپنی تقریر میں ہم لوگوں سے کہا تھا کہ ہم اپنی ریاست سے وفادار رہیں، ہم ہندوستان میں رہیں اس پہ جمال میاں صاحب نے قائداعظم سے کہا کہ آپ وہاں تشریف لے چلیں۔ ہم نے آپ کو اپنا قائد بنایا اب آپ ہم سے کہتے ہیں کہ ہم اپنی نئی قیادت اور بنائیں۔ ہم نے ایک اور لیڈر بنایا وہ بھی آپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہیں یعنی چودھری خلیق الزمان اب کیا ہمارا کام یہی ہے کہ ہم لیڈر بنائیں وہ ادھر تشریف لے آئیں۔[1]

مولانا جمال میاں صاحب نے فرمایا کہ جناح صاحب نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی ترمیم واپس لے لیں لیکن انہوں نے مؤدبانہ طریقہ سے معذرت طلب کی اور اصرار کیا اس پہ ہاؤس نے اپنی رائے دی ان کو سات ووٹ ملے تھے مگر جناب شریف الدین پیرزادہ نے اپنی کتاب FOUNDATIONS OF PAKISTAN میں یہ تحریر کیا ہے کہ یہ ترمیم واپس لے لی گئی تھی اس پہ مولانا جمال صاحب نے بڑے تعجب کا اظہار فرمایا جبکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اُن کی تحریک پیش ہوئی اور ان کو سات ووٹ ملے۔

اس جلسہ کی کارروائی پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے مولانا جمال میاں فرنگی محلی نے فرمایا کہ جب آل انڈیا مسلم لیگ کو تقسیم کرنے کی قرارداد پیش ہوئی تو جناب اشرف صاحب نے نکتۂ اعتراض اٹھایا کہ مسلم لیگ کونسل اس بات کی آئینی طور پہ مجاز نہیں ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو تقسیم کرے، لیگ کے دستور کے اعتبار سے یہ بات غلط ہے، اس

---

[1] قائداعظم نے جمال صاحب کے جواب میں فرمایا تھا کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ ہندوستان جانے کے لیے تیار ہوں اگر آپ اس کا فیصلہ کریں۔

کے لیے آپ کو سالانہ سیشن طلب کرنا چاہیئے یا خصوصی اجلاس ہو۔اس پر اشرف صاحب کی قائداعظم کے ساتھ بحث شروع ہو گئی۔ اس پر جناح صاحب نے فرمایا یہ میری رولنگ ہے۔ اشرف صاحب نے جواب دیا کہ میں آپ کو آئین کا حوالہ دے رہا ہوں، جس پر جناح صاحب نے کہا کہ آپ کب سے مسلم لیگ کے ممبر ہیں، اس پر اشرف صاحب بولے کہ آپ جب نہیں تھے اس وقت سے میں مسلم لیگ کا ممبر ہوں اس پر جھگڑا بڑھ گیا جناح صاحب نے فرمایا کہ مسٹر اشرف اگر آپ خاموش نہیں ہوں گے تو پھر مجھے آپ کے خلاف کارروائی کرنی ہو گی۔

اپنی تقریر کے تاثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا جمال میاں صاحب نے فرمایا کہ ہماری تقریر سے مولانا حامد بدایونی، مولانا عبدالباری اور دیگر حضرات بہت خوش تھے اور خصوصاً ہیو ناٹ (HAVE NOTS) جن لوگوں کو ابھی تک وزارتیں وغیرہ نہیں ملی تھیں جن میں خواجہ شہاب الدین وغیرہ تھے۔ حکومت پر میری تقریر کے دوران لوگوں نے شرم شرم کے نعرے بھی بلند کیے تھے۔ میاں افتخار الدین صاحب نے بڑی شاندار تقریر کی تھی ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ اگر آپ پاکستان میں اقلیتوں کو نہ رکھیں گے تو سردار پٹیل ہندوستان سے تمام مسلمانوں کو نکال دیں گے تو پاکستان تباہ ہو جائیگا۔ جناب سہروردی صاحب نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔

اگلے دن قائداعظم محمد علی جناح سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو جناح صاحب نے ان کی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ مجھے آپ کی نیک نیتی پر پورا اعتماد ہے۔ آپ نے پاکستان کی تخلیق کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اس دن جناح صاحب کے یہاں پارٹی تھی وہ اُدھر سے گزرے تو جناح صاحب نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ دیکھیئے آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ لوگ اسی بات کے مستحق ہیں کہ ان پر تنقید کرنا چاہیئے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا جمال میاں صاحب

نے فرمایا کہ لیگ میں ایک تو خلافت کے ورکر آ گئے وہ لوگ زیادہ تر برطانوی سامراج کے مخالف تھے مثلاً مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی وغیرہ یہ عوامی لوگ تھے اور زیادہ تر اقلیتی صوبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی سیاسی تربیت ہوئی تھی ان لوگوں کا ایک سیاسی پس منظر تھا۔ جہاں مسلم اکثریتی علاقوں کا تعلق ہے وہاں پر مسلمان ویسے ہی پس ماندہ تھے سوائے بنگال کے جہاں مسلم لیگ بڑی منظم تھی لیکن پورے مغربی پاکستان میں صورتِ حال مختلف تھی اول تو یہاں پرانے زمینداروں کا طبقہ تھا وہ مسلم لیگ کے ساتھ آیا، انہی لوگوں کے ہاتھ میں زمام تھی۔ سندھ میں جب پہلی مرتبہ ہم آئے تو پوری اسمبلی میں جو مسلمان اراکین تھے ان میں سے صرف سولہ ایسے تھے جو اپنے دستخط کر سکتے تھے تعلیمی معیار کم تھا، صوبہ سرحد میں جو حکومت تھی وہ H.N.KHANA کھنّا صاحب کے ہاتھ میں تھی پنجاب میں سر چھوٹو رام وغیرہ تھے، تو اس طرح اس علاقہ میں ایک تو تعلیم کی کمی دوسرے جو زمیندار تھے وہ اپنا خاص ذہن رکھتے تھے۔

پاکستان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے مولانا جمال میاں صاحب نے فرمایا کہ پاکستان کے متعلق جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہمارا خیال یہ تھا کہ یہ جمہوری ملک ہوگا اور اس میں ہندو سکھ بھی رہیں گے اور مسلمان بھی کیونکہ پاکستان ایک معاہدہ سے بنا تھا۔ ہندو، مسلمان اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا، اس کو ہم نے تلوار سے فتح نہیں کیا تھا، یہاں جو لوگ رہیں گے ان کے برابر کے حقوق ہونگے۔ گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کی قائدِ اعظم کی تقریر اسی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے نیز سہروردی صاحب کی یہ تجویز تھی کہ مسلم لیگ کا نام نیشنل لیگ رکھ دیا جائے اور اس کے دروازے تمام شہریوں کے لیے کھول دیے جائیں تاکہ ایک ایسی سیاسی جماعت قائم ہو جس میں ہندو، مسلم اور دیگر پاکستانی شامل ہو سکیں۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح صاحب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا

جمال میاں فرنگی محلی صاحب نے فرمایا میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ بہت سی باتوں کو سمجھ رہے تھے جبکہ ہم دھوکا کھا جاتے تھے اور معاملات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ایک موقع پر شملہ کانفرنس میں ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی کہ کانگریسی یہ چاہتے تھے کہ انتقالِ اقتدار ایک اتھارٹی کو ہو جائے جبکہ قائد اعظم کی یہ کوشش تھی کہ طاقت تقسیم ہو جائے کیونکہ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ اگر ایک مرتبہ کانگریس کو اقتدار حاصل ہو گیا اور ان کے ہاتھوں میں فوج اور پیسہ چلا گیا تو پھر اس کے بعد مسلمانوں کے لیے الگ ریاست بنانا تو بالکل ناممکن ہو جائے گا۔

مولانا جمال میاں صاحب نے شملہ کانفرنس کا ایک اور واقعہ بتایا کہ شملہ کانفرنس کے دوران ایک موقع ایسا بھی آیا جبکہ ہم نے جناح صاحب سے کہا کہ گاندھی جی کے ساتھ صلح کر لینی چاہیئے، آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ہماری تنظیم کیا ہے؟ اور ہماری کتنی طاقت ہے۔ وہ بھی متاثر ہو گئے اور میں بھی متاثر ہو گیا اس پر وہ فرمانے لگے کیونکہ میں کمزور ہوں تو مجھے خودکشی کر لینی چاہیئے" یعنی مطلب یہ تھا کہ چونکہ میں کمزور ہوں لہٰذا میں ان کی ہر بات قبول کر لوں، پھر جناح صاحب نے صورتِ حال کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ یہ حضرات یعنی گاندھی جی اور جناب پنڈت نہرو صاحب خواہ کہتے کچھ ہی ہوں، ان کے کہنے پر نہ جانا چاہیئے جب تک ہم آئینی طور پر محفوظ نہ ہو جائیں ان کی باتوں کا بھروسہ نہ کرنا چاہیئے، کتابوں میں وہ اچھی باتیں لکھتے ہیں ان کی کتابوں پر نہ جاؤ ان کے عمل کو دیکھو۔

شملہ کانفرنس ہی میں ایک موقع پر جبکہ نواب اسمٰعیل خاں صاحب نے جناح صاحب پر اعتراض کیا کہ آپ نے وائسرائے کا دعوت نامہ قبول کر لیا پھر ہم کو بلایا، آپ پہلے میٹنگ طلب کرتے پھر ہماری رائے سے آپ آگے بڑھتے مگر آپ نے پہلے دعوت نامہ قبول کر لیا ہے پھر ہمیں بلایا ہے، تو اس پر جناح صاحب سے تیز تیز گفتگو کرنے لگے، جناح صاحب نواب اسمٰعیل خاں صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کا خیال

رکھتے تھے، قائداعظم نے اپنی پوزیشن کو واضح کرنے کے لیے کچھ اخبارات کے حوالے دیے، اس پر نواب صاحب اور بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ آپ اخباروں کے حوالے سنا کر بچوں کی طرح بہلا رہے ہیں، جناح صاحب اپنی صفائی پیش کرتے رہے اور اس مقام پر انہوں نے مسلم لیگ کی ارتقائی منزلوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ذرا دیکھیں کہ شروع میں مسلم لیگ کی کیا حالت تھی جب میں نے اس کو سنبھالا، اس وقت میرے ساتھ کتنے لوگ تھے، ایک میں تھا اور میرا ٹائپ رائٹر تھا، سب کام میں کرتا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ کا یہی حال تھا۔

ادارہ کی دیگر مطبوعات

(۱) احمد سعید: "گفتار قائداعظم"، ۱۹۷۶ء، ۲۲۸ + ص ص ۶۰/- روپے

(۲) آغا حسین ہمدانی: "فاطمہ جناح - حیات و خدمات"، ۱۹۸۰ء، ۱۹۲ ص ص، طبع دوم، ۱۹۸۹ء ۸۰/- روپے

(۳) احمد سعید: "حیات قائداعظم - چند نئے پہلو"، ۱۹۷۹ء، ۱۴۴ + ۴ ص ص ۳۰/- روپے

(۴) غلام مصطفےٰ خان: "مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل"، ۱۹۸۱ء، ۲۸۸ + ۴ ص ص ۴/- روپے

(۵) پروین روزینہ: جمعیت علمائے ہند - دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام، ۱۹۱۹ - ۱۹۴۵ء، دو جلدیں،

جلد اوّل، ۱۹۸۰ء، ۵۰۸ ص ص ۶۵/- روپے

جلد دوم، ۱۹۸۱ء، ۳۵۴ ص ص ۶۰/- روپے

(۶) عذرا سلطانہ، وارث شاہ - عہد اور شاعری"، ۱۹۸۱ء، ۲۲۵ ص ص ۴۵/- روپے

(۷) عبیداللہ قدسی: "اسلام کی انقلابی علمی تحریک"، ۱۹۸۱ء، ۱۱۰ + ص ص ۲۰/- روپے

(۸) شفیع النساء: "کتابیاتی اشاریہ پاکستان - ۱۹۴۷ء"، ۱۹۸۲ء، ۲۶۰ ص ص ۵۰/- روپے

(۹) منظور الحق صدیقی: "قائداعظم اور راولپنڈی"، ۱۹۸۵ء، ۱۲۲ ص ص ۳۰/- روپے

(۱۰) پیرزادہ محمد حسین: "سفرنامہ ابن بطوطہ" (اردو ترجمہ) طبع ثانی ۷۵/- روپے

(۱۱) مرزا شفیق حسین: "کشمیری مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد، ۱۹۳۱ء - ۱۹۳۹ء
منتخب دستاویزات"، ۱۹۸۵ء، ۱۴۱ + ۵ ص ص — ۱۰۰/= روپے

(۱۲) ایچ۔بی۔خان: "برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار"
۱۹۸۵ء، ۴۷۶ ص ص — ۱۲۵/= روپے

(۱۳) ڈاکٹر اے ڈی مضطر: "خاکسار تحریک اور آزادیٔ ہند"، ۱۹۸۵ء، ۱۲۰ + ۳۰۴ ص ص
۱۲۰/= روپے

(۱۴) آغا حسین ہمدانی: "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس - (دستاویزات)
صدارتی خطبات اور قرار دادیں۔
۱۸۸۶ء - ۱۹۰۶ء" دو جلدیں
جلد اوّل = ۱۹۸۶ء، ۱ - ۳۶۸ + ۱۸ ص ص — ۱۵۰/= روپے
جلد دوم = ۱۹۸۶ء، ۳۶۹ - ۵۴۴ + ۱۶ ص ص — ۵۰/= روپے

(۱۵) محمود الرحمان: "جنگ آزادی کے اردو شعراء: ۱۸۵۷ تا ۱۹۴۷ء"
۲۳۴ + ۱۲ ص ص — ۱۲۰/= روپے

(۱۶) محمد سعید: "آہنگ بازگشت"۔ ۵۰۴ ص ص — ۱۱۰/= روپے

قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت
پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۰ ——— اسلام آباد

ہماری دیگر مطبوعات

مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل
غلام مصطفیٰ خان (مرتب)

جمعیت العلماء ہند، دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام ۱۹۱۹ء۔ ۱۹۴۵ء دو جلدیں
پروین روزینہ (مرتب)

کشمیری مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد، ۱۹۲۱ء۔ ۱۹۳۹ء منتخب دستاویزات
مرزا شفیق حسین (مرتب)

برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار
ایچ۔ بی۔ خان

خاکسار تحریک اور آزادیٔ ہند
اے۔ ڈی۔ مضطر

جنگِ آزادی کے اُردو شعراء
محمود الرحمان

قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت
پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۰، اسلام آباد
۱۹۹۰ء